قرآن کریم اور سنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسّلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۷ شمارہ: ۱۰
شوال المکرم: ۱۴۴۵ھ - مئی: ۲۰۲۴ء
قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِ سالانہ: ۷۰۰ روپے

مُدیر / مُدیرِ مسئول
مولانا سیّد سلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر
مولانا سیّد احمد یوسف بنوری

مُدیرِ معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک
یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر
عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر
اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

وضاحت

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: 92-21-34919531 +
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

بھوک کا ہتھیار اور کرنے کا کام!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

مکاتیب حضرت مولانا احمد رضا بجنوریؒ بنام حضرت بنوریؒ	۷	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
انسان کے فکری اِرتقا میں اسلامی عقائد کی کارفرمائی!	۱۱	حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ
مملکتِ خداداد میں سدومیت کی راہیں ہموار کرنے کی تدبیریں	۲۷	مولانا محمد طفیل کوہاٹی
فلسطین کے حقیقی باشندے اور حقدار	۳۶	مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی
اچھے اور برے ناموں کے اثرات کی شرعی حقیقت!	۴۵	مولانا سید انور شاہ
طبی اخلاقیات (دائرہ کار، ضوابط، اخلاقی قدریں) (قسط:۱)	۵۳	مولانا ڈاکٹر فہد انوار

دار الافتاء

کسٹم کا ضبط کردہ امپورٹڈ مال نیلام کرنا اور اُسے خریدنا	۵۹	ادارہ

نقد و نظر

قدرتی غذاؤں سے مہمان نوازی ... معروضاتِ جمعہ	۶۴	ادارہ

بھوک کا ہتھیار اور کرنے کا کام!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و سلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

پاکستان کے حالیہ انتخابات ۸؍فروری ۲۰۲۴ء کو مکمل ہو گئے۔ بظاہر مرکز اور صوبوں میں حکومتیں بن گئیں، صدارتی انتخاب بھی ہو گیا، لیکن ابھی تک حکومتی اتحاد کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت ان انتخابات سے مطمئن نظر نہیں آتی اور یہ اصطلاح اس بار عام ہوئی کہ فارم ۴۵ والے ہرا دیے گئے اور فارم ۴۷ والے حکمران بنا دیے گئے، کئی ایک کے نتائج تبدیل ہوئے اور ہار جیت کے نوٹیفکیشن بار ہا کئی تبدیلیوں کے باوجود ابھی تک جاری ہو رہے ہیں۔ گویا نہ ہارنے والوں کو ابھی تک اپنی ہار کا یقین ہے اور نہ جیتنے والوں کو ابھی تک کوئی اطمینان ہے۔ دوسری طرف الیکشن کے بعد چند دن دہشت گردی میں وقفہ ضرور نظر آیا، لیکن پاکستان کی فورسز پر کئی مقامات پر دہشت گردانہ حملے پھر شروع ہو گئے، جس میں دو افسران کے علاوہ کئی ایک سپاہی جامِ شہادت نوش کر گئے۔

ادھر اندرونِ سندھ میں کچے کے ڈاکوؤں کا راج ہے، جو عوامی ٹریفک پر کئی بار فائرنگ کر چکے ہیں، کئی ایک ڈرائیوروں کو اغوا کیا، اور انہیں زدوکوب کے علاوہ ان سے بھاری تاوان بھی طلب کیے گئے۔ ایک اسکول ٹیچر جو کہ اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے، ان کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا، کچھ دنوں کے بعد ایک اور اسکول کے استاذ کو قتل کر دیا گیا۔ شنید یہ ہے کہ کچے اور پکے کے ڈاکو برملا اور بڑے دھڑلے سے یہ کہتے ہیں

کہ پولیس ہو یا کوئی اور فورس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اس لیے کہ پولیس میں ہمارے آدمی موجود ہیں جو ہر کارروائی سے پہلے ہمیں اطلاع پہنچا دیتے ہیں۔ دوسری طرف صرف کراچی میں دن دیہاڑے اسٹریٹ کرائم میں خوفناک حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ کئی ایک وارداتوں میں تو ڈاکوؤں نے مال لوٹنے کے ساتھ مظلوم شہریوں پر گولیاں چلادیں، جس سے وہ زندگی کی بازی ہار گئے۔ ان ڈاکوؤں سے گویا نہ اب جان محفوظ ہے اور نہ مال اور عزت وآبرو محفوظ ہے۔ ان حالات میں ملک میں امن وامان آئے تو کیسے آئے اور ملک معاشی طور پر مستحکم ہوتو کیسے ہو؟

حکومت بن جانے کے باوجود ابھی تک مہنگائی کے کنٹرول میں اور خورد ونوش کی اشیاء کی قیمتوں میں کوئی استحکام نظر نہیں آرہا اور یہ آبھی کیسے سکتا ہے، اس لیے کہ آئی ایم ایف سے ابھی پچھلا قرضہ لینے کے لیے ان کی کتنی سخت سے سخت شرائط مانی گئیں، جس کی بنا پر ہر چیز کی قیمت میں ہوشربا اضافہ ہوا اور ابھی پھر سے وزیر اعظم صاحب قوم کو خبردار اور تیار کررہے ہیں کہ اگلے تین سال کے لیے آئی ایم ایف کے قرض پروگرام میں جانے کے لیے ہمیں کئی سخت فیصلے کرنے پڑیں گے۔ پٹرول اور گیس کی قیمتوں میں جولائی سے ایک بار پھر مزید اضافہ کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں تنخواہ دار اور دیہاڑی دار مزدور کہاں جائے؟ اور کرے تو کیا کرے؟ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے۔

لگ یہ رہا ہے کہ بین الاقوامی مالی ادارے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اسلامی ملک ہونے اور غزہ کے مظلوم مسلمانوں کی مدد ونصرت اور تعاون کی پاداش میں ان پر بھی بھوک کا ہتھیار مسلط کررہے ہیں، جیسا کہ غزہ میں تیس سے پینتس ہزار بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور بزرگوں کو بموں، گولیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے شہید کرنے کے علاوہ زندہ بچ جانے والوں پر خوراک، پانی اور دوسری اشیائے ضروریہ کی ترسیل روک کر ان پر بھوک کا ہتھیار استعمال کیا جارہا ہے۔ ایک برطانوی صحافی کے بقول رفح کے خیموں میں رہنے والوں کے لیے ایک کلو آٹے کی قیمت (وہ بھی اگر مل جائے تو) ۴۰ پاؤنڈ (پاکستانی ۱۴ ہزار سے زیادہ) ہے۔

اس پُرہجوم شہر کے زیادہ تر لوگ پہلے ہی اسرائیل کی طرف سے ہونے والی شدید جارحیت اور خوفناک تباہی کی وجہ سے بے گھر ہوچکے ہیں، ہزاروں خاندان سڑکوں، اسکولوں اور ہسپتالوں کے صحن میں یا چوراہوں پر رہنے پر مجبور ہیں، ان کے پاس پناہ لینے کے لیے کوئی تہہ خانے نہیں، بھاگنے اور اسرائیل کی وحشیانہ بمباری سے چھپنے کو کوئی جگہ نہیں۔

غزہ شہر میں لوگ گھاس کھانے پر مجبور ہیں اور جانوروں کی خوراک سے روٹی بنارہے ہیں۔

عالمی تنظیم آکسفیم نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ یہاں نسل کشی کا خطرہ بڑھ رہا ہے اور تقریباً تین لاکھ افراد اب بھی یہاں چار ماہ سے امداد سے تقریباً مکمل طور پر منقطع ہونے کے باوجود مقیم ہیں۔ مزید کہا کہ شمالی غزہ کے علاقے میں اب ہر طرف تباہ کن بھوک کا راج ہے، لوگ بیت الخلاء کا پانی پیتے ہیں اور جنگلی پودے کھاتے ہیں۔

امریکا، برطانیہ اور مغربی دنیا ایک طرف اسرائیل کو اسلحہ اور فوجی قوت مہیا کررہے ہیں، دوسری طرف امریکا کا صدر جو بائیڈن اسرائیل اور حماس کے درمیان جنگ بندی کرانے کا معاہدہ کرانے کے لیے سلامتی کونسل میں قرارداد لے کر گیا ہے، جسے چین اور روس نے رفح پر حملے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش قرار دے کر مسودہ ویٹو کردیا۔ اخبارات کی خبروں کے مطابق غزہ میں جنگ بندی کی آڑ لے کر حماس کے خلاف سلامتی کونسل میں پیش کردہ امریکی قرارداد چین اور روس نے ویٹو کردی، الجیریا نے بھی قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ قرارداد میں امریکا نے سلامتی کونسل سے حماس کی مذمت کا مطالبہ کیا تھا۔ روس نے اپنے ردِعمل میں کہا کہ قرارداد کا مقصد رفح پر اسرائیلی حملے کے لیے جواز پیدا کرنا ہے۔ چینی مندوب نے اپنے سخت ردِعمل میں کہا کہ یہ قرارداد عالمی توقعات سے بہت نیچے ہے، امریکی مسودے میں جنگ بندی کے لیے جو شرائط درج کی گئی ہیں، وہ فلسطینیوں کو قتل کرنے کے لیے گرین سگنل دینے کے مترادف اور ناقابلِ قبول ہیں۔ قرارداد ویٹو ہونے کے بعد اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ امریکا ساتھ دے یا نہ دے، اسرائیلی فوج رفح پر حملہ ضرور کرے گی۔

ان حالات میں عوام الناس کے بس میں جو کچھ ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے مظلوم فلسطینی بھائیوں کی دامے، درمے، قدمے، سخنے، مدد ونصرت اور تعاون کے ساتھ ساتھ ہر پاکستانی اپنے ان مظلوم بھائیوں کو دعاؤں میں یاد رکھنے کے علاوہ اپنے ملک کی خوشحالی، سلامتی، استحکام اور پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلام کا قلعہ بنانے کی خلوص کے ساتھ دعائیں مانگے، اس لیے کہ آج کے مادی دور میں خدا تعالیٰ سے مانگنے کی ضرورت کو یکسر فراموش کردیا گیا ہے اور اچھے اچھے متدین لوگ بھی حق تعالیٰ سے مدد مانگنے پر اتنا اعتماد نہیں کرتے، جتنا کہ اپنی ظاہری تدابیر پر کرتے ہیں۔ کسی قوم کی کامیابی وکامرانی یا اس کی ذلت وناکامی ارادۂ خداوندی اور خشیتِ الٰہی کے تابع ہے، قرآن کریم میں ہے:

’’إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ ۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔‘‘ (آلِ عمران:۱۶۰)

ترجمہ: ''اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد سے ہاتھ کھینچ لے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے؟ اور اہلِ ایمان کو صرف اللہ بھروسہ کرنا چاہیے۔''

آج مسلمان جن حالات سے گزر رہے ہیں، ایک طرف حکمرانوں کی بے حسی اور دوسری طرف مسلم عوام کا ہر جگہ استحصال۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف خلوص اور تضرع کے ساتھ دعاؤں کے ذریعہ متوجہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم لوگ مجلسوں میں، ہوٹلوں میں یا دفتروں میں حالاتِ حاضرہ پر لایعنی اور بے مقصد تبصرے کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں، حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہمارے تبصرے حالات کی اصلاح کے لیے ذرہ برابر کارآمد نہیں، ان تبصروں کی بجائے اگر ہمارے وقت کا کچھ حصہ بھی دعا، انابت اور رجوع الی اللہ میں خرچ ہونے لگے تو حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو سکتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ'' (المومن:۶۰)

ترجمہ: ''اور کہتا ہے تمہارا رب: مجھ کو پکارو کہ پہنچوں تمہاری پکار کو، بے شک جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری بندگی سے، اب داخل ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہو کر۔''

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد و علیٰ آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

خوشخبری

اشاعتِ خاص شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہے

صفحات: 864 قیمت:1200

رابطہ نمبر (واٹس اپ) - ایزی پیسہ اکاؤنٹ
0341-3490550

مکتبہ بینات

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

مکاتیب حضرت مولانا احمد رضا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم ومحترم، دام مجدُکم وعمّت فیوضُکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عرصہ سے گرامی نامہ نہیں ملا، شاید مصروفیت مانع رہی ہو، اکثر آپ سے دوری کا شدید احساس وقلق رہتا ہے، اس وقت آپ کے مشوروں کی بہت ضرورت تھی۔ خیر! خدا آپ کو علم ودین کی خدمت کے لیے عمرِ نوح عطا کرے، ہر وقت دعا ہے کہ آپ کی حدیثی خدمات منظرِ عام پر جلد آجائیں۔ شرحِ ترمذی (معارف السنن) کا کیا ہوا؟ تھوڑا تھوڑا اشاعت کا کام شروع ہوجانا چاہیے۔ حالات سے مطلع کریں۔ کسی وقت خیال ہوتا ہے کہ آپ اب صرف تصنیف میں لگ جاتے تو بڑا کام ہوجاتا، مگر آپ نے درس کے ساتھ انتظامی معاملات کا بھی دردِ سر لیا ہے، جو ایک علمی آدمی کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔ میں تو آپ جیسے حضرات کے لیے درس کو بھی ثانوی درجہ میں سمجھتا ہوں۔ اگر حضرت شاہ صاحب (مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ) نے آخر کے صرف چار پانچ سال میں بھی تصنیف کا کام کیا ہوتا تو کتنا بڑا کام ہوجاتا۔ خیر! چھوڑیے اس تلخ بحث کو۔

نمنکانی (مصری ناشر وکتب فروش)، ’’تحفۃ الأحوذي‘‘ کو مصر میں چھپوا رہے ہیں، (مصنف کے) ورثہ سے بھی اجازت لے لی ہے، میں نے مولانا بدرِ عالم صاحب کو لکھا تھا کہ ان کو سمجھائیں کہ کوئی اور حدیثی کتاب چھاپیں، ’’تحفۃ الأحوذي‘‘ تو چھپ چکی ہے، ملتی بھی ہے، اور بہت خطرناک ہے، تلبیس سے بھی بہت کام لیا ہے، وغیرہ۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ کام یہاں کے لوگوں کی تحریک وامداد سے وہ کررہے ہیں، تم جانتے ہو جیسے خیال کے یہ لوگ ہیں، اس لیے یہ کام تو وہ ضرور کریں گے،، البتہ اگر تعلیقات اس پر ہوجائیں تو وہ

بھی ساتھ میں چھاپ سکتے ہیں۔ تو میرا خیال ہوا کہ آپ کو فرصت ہو یا مولانا عبدالرشید صاحب (نعمانی) یا مولانا ظفر احمد صاحب (عثمانی) وغیرہ، اگر قلم برداشتہ بھی (علامہ محمد زاہد) کوثری صاحب کی طرح کی تعلیقات (تحریر) کردیں گے تو بڑا کام ہوجائے گا۔ یہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے بھی تحریک کروں گا، جنہوں نے مسند احمد (جدید طبع، مصر) کی تعلیقات پر مواخذات کیے ہیں، اور پندرہویں جلد میں چھپ گئے ہیں۔ غرض جیسے رائے ہو لکھیے!

''محلی'' (ابن حزم رحمہ اللہ) دیکھتا ہوں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے، اپنے حضرات نے اس کے لیے بھی کچھ نہ کیا، مفتی (مہدی حسن شاہ جہانپوری) صاحب، ''کتاب الحجج'' (كتاب الحجة على أهل المدينة) پر تعلیقات (تحریر) کررہے ہیں، اس میں ان سے زور دے کر اس پر کچھ لکھوا تا ہوں، خود بھی انہیں احساس ہے۔ غالباً آپ نے ''شرح ترمذی'' میں اس کو سامنے رکھا ہے۔ لیکن مفتی صاحب کی صحت بہت گر چکی ہے، بہت کام نہیں کرسکتے۔ ان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، افتاء کے کام میں لگے ہیں...۔

مولانا ابوالوفاء (افغانی) نہایت متمنی ہیں کہ ''کتاب الحجج'' کی تعلیقات جلدی (تحریر) کردیں تو وہ چھپوادیں، مگر وہ پورا نہ کرسکے، میں نے کئی بار کہا کہ باقی ربع حصہ کو مختصر مختصر کرکے پورا کردیں تو یہ بھی نہیں ہوتا۔

حصہ دوم مقدمہ انوار الباری زیرِ طبع ہے، حضرت شاہ صاحب کے حالات مع ایک سو تلامذہ کے آگئے ہیں، علمی زندگی کو زیادہ نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔ آپ نے ابھی ممالکِ اسلامیہ کا دورہ کیا، اس کا مختصر حال مطبوعہ سفر نامہ شائع کردیتے، ذرائع طریقے پر بھی آپ کا تعارف ہونا چاہیے۔

مدینہ یونی ورسٹی کے سلسلہ میں مودودی صاحب گئے، آپ جاتے تو کتنا بڑا علمی نفع ہوتا۔ یہ ایک بہت بڑا محاذ بن رہا ہے، اس کے نصاب پر ہی کچھ لکھ کر شائع کردیجیے، یا یہاں بھیج دیں، رسالہ دار العلوم (دیوبند) وغیرہ میں شائع کرادوں۔ ان سب باتوں پر ضرور آپ کی نظر ہوگی۔ کہنا یہ ہے کہ اپنی غیر ضروری انتظامی مصروفیتوں کو دوسروں سے کام لے کر ادھر کے خالص علمی، تصنیفی وغیرہ کاموں کی طرف زیادہ توجہ کیجیے، بلکہ جس طرح بھی ہوسکے، اپنے حالات، نظریات اور صحت وعافیت وغیرہ سے مہینہ میں ایک دو بار ضرور مطلع کرتے رہیں، ممنون ہوں گا۔

والسلام: احقر احمد رضا (دیوبند)

۲۳ر دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء

پس نوشت: اور بہت کچھ لکھنا ہے، مگر میں بھی بہت سے کاموں میں گھر گیا ہوں، چاہتا ہوں کہ

مدرسہ سے سبکدوش ہوکر صرف ''انوار الباری'' کا کام کروں، مگر ابھی تک حالات سازگار نہیں ہیں۔ ''انوار الباری'' کے سلسلہ میں چند معاونین ومحسنین مہیا ہوجائیں تو کام آگے بڑھے۔ بہر حال خدا کے بھروسہ پر ایک کام کیا ہے، آپ کی خاص دعاؤں، مفید مشوروں اور خصوصی توجہات کی ہر وقت ضرورت ہے، امید (ہے) کہ خط لکھتے رہیں گے۔

مکرم ومحترم، دام مجدُکم وعمّت فیوضُکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اُمید (ہے) کہ مع متعلقین بعافیت ہوں گے، عرصہ سے کوئی خط نہیں ملا، فکر ہے۔ غالباً مولانا طاسین صاحب بھی سفرِ مبارک حج پر روانہ ہوگئے، ورنہ وہ آپ کی عافیت بھی لکھتے رہتے تھے۔ جلد دوم مقدمہ (انوار الباری) ارسال کر چکا ہوں، ملاحظہ کیا ہوگا، خصوصی ملاحظہ کے لیے ٹائٹل کے صفحے پر نشان دہی کی ہے۔ براہِ کرم وقت نکال کر ایک تنقیدی نظر ڈال لیں، اور جلد مجھے اپنے تأثرات اور مفید اصلاحی مشوروں سے نوازیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات بھی پڑھ لیں، (حضرت شاہ صاحبؒ کے) نسب کا مسئلہ بھی میں نے حاجی محمد صاحب کے مشورہ کے بعد صاف کردیا ہے، گول مول چل رہا تھا، جو اتنی بڑی شخصیت کے بارے میں موزوں نہ تھا۔ امام بخاریؒ کے بارے میں (مقدمہ کے) پہلے حصہ میں اور اس حصہ میں جو کچھ آچکا ہے، اس کے بارے میں آپ کے خصوصی تأثرات کا علم میرے لیے ضروری ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا خط آیا تھا کہ اس سے منکرینِ حدیث کو تقویت ملے گی، وغیرہ۔ اس کا جواب میں نے رجسٹری سے ہوائی ڈاک سے بھیج دیا تھا، جو یہاں مفتی (مہدی حسن شاہ جہان پوری) صاحب اور علامہ مولانا محمد ابراہیم (بلیاوی) صاحب کو بھی دکھلا دیا تھا، دونوں نے پسند کیا، اور اس کو تسلیم کیا کہ جب سب کے تذکرے بے کم وکاست مقدمہ میں لکھنے تھے تو ضروری چیزوں کا آنا اور ایک دفعہ پوری صفائی سے لکھ دینا مناسب تھا۔ دوسرے یہ کہ بحیثیت محدث کے میں نے خود بھی امام بخاریؒ کو تنقید سے بالاتر تسلیم کیا ہے، لیکن نقدِ رجال میں تسامحات یا بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے بے انصافی ہوئی ہے، اس کو لکھنا ضروری تھا۔ اب تاریخ بخاری کبیر اور کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم اور کتاب خطأ البخاري في التاریخ (بیان خطأ البخاري في تاریخہٖ لابن أبي حاتم) بھی چھپ کر آگئی ہیں، اس کو بھی سامنے رکھ کر کچھ کام کرنا ہے۔ اس تمام سفر میں آپ کی رہنمائی ومشورہ قدم قدم پر ضروری تھا، مگر افسوس کہ آپ دور ہیں اور بہت مشغول!

نواب صدیق حسن خان اور مولانا نذیر حسین صاحب ومبارک پوری صاحب (مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری صاحبِ تحفة الأحوذي) پر جو کچھ نقد ہوا ہے، وہ بھی دوسروں پر شاق ہے۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب (ندوی) نے بھی خط لکھا ہے، اور ان حضرات مؤخر الذکر پر تنقید کی شکایت کی ہے۔ بہر حال یہ سب تو ہوتا رہے گا۔ میں نے مدرسہ سے ٦ ماہ کی رخصت لے کر ''بجنور'' رہ کر صرف ''انوار الباری'' کا کام کرنے کا ارادہ کرلیا ہے، بلکہ رخصت میں اور اضافہ کا ارادہ ہے۔ جون میں کشمیر بھی جانے کا ارادہ ہے، آپ فرمائیں گے تو پاک سرزمین کا بھی ارادہ کروں گا۔ بچوں کو دعائیں۔ جواب جلد دیجیے۔

احقر: احمد رضا

۵ رمئی سنہ ۱۹۶۲ء

نوٹ: یہ مکتوب، کارڈ پر لکھا گیا ہے، پتہ یوں درج ہے: ''بملاحظۂ گرامی حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری دام مجدُہم، مدرسہ عربیہ جامع مسجد نیوٹاؤن، کراچی۔''

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

انسان کے فکری اِرتقا میں اسلامی عقائد کی کارفرمائی

حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

①- ایمان وعمل صالح

دینداری کا جذبہ انسان کی ایک طبعی تحریک ہے، جس طرح انسان اپنے جسم کی تربیت اوراس کے دوام وبقا کے متعلق طبعی طور پر چند ''ضرورتوں'' کا احساس کرتا ہے، اسی طرح یہ بھی اس کا طبعی وجدان ہے کہ اس کائنات سے بالاتر ایک قوت موجود ہے، جس کی قدرت وطاقت کے سامنے کائنات کی تمام قوتیں سرنگوں ہیں۔ گردوپیش کی موجودات، ان کے باہمی ربط، اور خاصیتوں کو دیکھ کر اپنے اپنے علم وشعور کے مطابق انسانوں کو یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ طاقت محض ایک بےعلم بےارادہ قوت ہی نہیں ہے، بلکہ علم وحکمت، ارادہ واختیار اور تصرف کی صفات کی بھی مالک ہے، جس نے اشیاء اور ان کی خاصیتوں کے درمیان، اسباب اوران کے نتائج کے درمیان ربط قائم کیا ہے اور ایک ایسے حکیمانہ طریقہ پر موجودات کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا ہے جو انسانی عقل وشعور کے لیے ہمیشہ حیرت اور تعجب کا سبب رہا ہے۔

تدیُّن کے محرکات

ایک علیم وحکیم، قادر وتوانا، صاحبِ ارادہ اور فاعلِ مختار ہستی کے متعلق انسان کے اس شعور ووِجدان ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب بھی وہ کائنات کی قوتوں کے سامنے اپنی بےبسی کومحسوس کرتا ہے یا سلسلۂ اسباب وروابط کے مقابلہ میں خودکو عاجز ومجبور پاتا ہے اورخوداس کی اپنی ہستی خطرات میں گھر جاتی ہے تو اس کی غفلتوں کے وہ تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں جونفسانی خواہشات اور جسمانی ضرورتوں کے تقاضوں نے اس کے اس فطری وجدان پر ڈال دیئے تھے، وہ ان خوفناک قوتوں کے مقابلہ میں اپنے وجود وبقا کے لیے اُسی قادر وتوانا ذات کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، اُس کے سامنے اپنی مجبوری وعاجزی کا اظہار کرتا ہے اور

اسی کو اپنی مدد کے لیے پکارتا ہے۔ قرآن حکیم نے اسی فطرتِ انسانی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو اور وہ خوشگوار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ لوگوں کو لے کر چلتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوجاتے ہیں تو اچانک تیز و تند ہوائیں ان کشتیوں کو گھیر لیتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ہر طرف سے سمندر کی موجیں بھی اُن کو گھیر لیتی ہیں اور وہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ اب وہ گھر گئے تو ''اللہ'' کو پکارتے ہیں، اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے کہ اے اللہ! اگر اس مصیبت سے آپ نے نجات دے دی تو ہم ضرور شکر گزار بندوں میں شامل ہوجائیں گے۔'' (سورۂ یونس)

دینداری کی اس طبعی تحریک نے ایک طرف کبھی انسان کو نہروں، پہاڑوں، دریاؤں اور درختوں کے سامنے سر جھکانے کی طرف مائل کیا اور کبھی حیوانات کی طرف اور کبھی غیر معمولی طاقتوں کے مالک انسانوں اور ارواح میں اس قدرتِ مطلق کی جستجو کے لیے اُبھارا جس کو وہ اپنا اور اپنے گرد وپیش کی چیزوں کا خالق و مربی سمجھتا تھا۔ دوسری طرف مذاہب اس کو خدا، رسول، آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتے رہے، روزِ حساب، جزا وسزا اور موت کے بعد کی زندگی کا یقین دلاتے رہے، لیکن انسانیت اپنے تاریک دوروں میں عقل وتجربہ کی انہی متضاد راہوں میں بھٹکتی رہی جو ہر دور میں اپنی سمت بدل لیتی تھیں۔

ایک طرف انسان تجربہ اور مشاہدہ کے تحت بدلتے ہوئے نظریات اور نتائج کے درمیان اپنے علم وعمل کی راہ بنانے کی کوشش کررہا تھا اور دوسری طرف نام نہاد مذہبی نمائندوں نے اس کے گرد خودساختہ آہنی دیواریں قائم کردی تھیں۔ جسمانی ضروریات اور خواہشات کی تنظیم کے نام پر صرف حکومت اور سیاست ہی نے اس کی مادی زندگی کی آزادیوں کو نہیں چھینا، بلکہ مذہب کے جھوٹے دعویداروں نے بھی انسان اور اس کی وِجدانی حقیقت یعنی بندے اور اس کے معبود کے درمیان مداخلت جاری رکھی۔ وہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایسے واسطہ بن بیٹھے، جو چاہتے تو لوگوں کے لیے خدا کی طرف لوٹنے کا دروازہ کھولتے اور چاہتے تو اس وقت تک اس دروازہ کو بند رکھتے جب تک وہ خدا تک پہنچانے کی قیمت وصول نہ کرلیں۔

دینی وفکری آزادی

اسلام نے انسان کی اس کھوئی ہوئی آزادی کو واپس دلایا۔ بدلتے ہوئے نظریات اور غیر یقینی نتیجوں کی بھول بھلیاں سے اُسے نکالا۔ مذہبی توہمات اور مذہبی اجارہ داروں کی خودساختہ اِجارہ داری کو ختم کیا۔ خدا اور بندوں کے درمیان اِن جھوٹے واسطوں کو رد کیا، اس نے انسانیت کو ایک صاف ستھرے اور روشن علم ویقین کا سرمایہ دیا، اس نے صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کیا: خدا اپنے بندوں سے قریب ہے، وہ پکارنے والوں کی پکار سنتا ہے، اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، اور ان کی لغزشوں سے درگزر کرتا ہے۔

گناہوں سے توبہ اور عبادت کی قبولیت کے لیے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس عقیدہ ویقین نے انسان کی عزت وشرف کی حفاظت کی اور اس کو غیر اللہ کے سامنے بندگی وعاجزی سے بچایا، اس کی عقل وفکر کو بلند اور روشن کیا، اور عمل کے لیے علم ویقین کی مضبوط بنیادیں قائم کیں۔ اس کے مستقبل کے لیے امید وآرزو کے دروازے کھلے۔ اسلام نے بتلایا کہ آخری اور واقعی حقیقت پر ایمان اور اس کے صحیح علم ویقین ہی پر صحیح عمل کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں اور صحیح عمل ہی پر انسان کی عظمت وکرامت اور اس کی زندگی کی کامیابی اور اس کے مستقبل کی فلاح موقوف ہے۔ یہ ایمان یا علمِ صحیح، عقل وشعور کی تجربہ گاہوں کی پیداوار نہیں، اس کا سرچشمہ اس خالقِ کائنات کی آسمانی تعلیم ہے جس نے کائنات کو لامحدود اَسرار کا خزانہ بنایا ہے۔ تجربات ومشاہداتِ عقل کا وہ طویل سفر جو انسان نے زمانہ کے ساتھ طے کیا ہے اور ان تجربوں کے ناپائیدار نتیجے، نورِ یقین سے محروم، عقل وفکر کی نامرادی کا سب سے زیادہ روشن ثبوت ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

’’زمانہ کی قسم! انسان خسارہ ہی میں رہا ہے، بجز ان لوگوں کے جنہوں نے ایمان قبول کیا اور (ایمانی تقاضے کے مطابق) نیک کام کیے۔‘‘ (سورۂ عصر)

ایمان وعمل کے متعلق اسلام کے ان عقیدوں نے صرف مسلمانوں ہی کو متاثر نہیں کیا، مجموعی طور پر پورا انسانی ذہن وفکر ان سے متاثر ہوا۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی اپنے بہت سے مذہبی توہمات، مذہبی اجارہ داروں کی گرفت، راہبوں، پاپاؤں اور اوتاروں کی غلامی سے آزادی حاصل کی، اس طرح علم اور یقینِ محکم کی روشنی میں انسانی فکر وعمل کی ترقی کے لیے نئی اور کشادہ راہیں پیدا ہوئیں۔

۲-توحید ومساوات

عمل کا مدار اور مرکزیت

انسانی افراد اور جماعتوں کی نفسیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی اعمال کے صدور کا مدار قوتِ اِرادی پر ہوتا ہے اور اِرادہ بہت بڑی حد تک عقل کے تابع ہے۔ جب عقل کسی چیز کو قبول کر لیتی ہے اور اس کو یقین حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کا ارادہ اس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ یقین ہی دراصل وہ تحریکِ عمل ہے جس کی وجہ سے عمل ظہور میں آتا ہے اور کسی چیز کو موجود یا باقی رکھتا ہے۔

عمل کے مفید اور نتیجہ بخش ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یقین میں مرکزیت اور اس کے نتیجہ میں اعمال کے اندر یکسانیت موجود ہو، یقین کی لامرکزیت اور اعمال کے انتشار کی صورت میں زندگی کے اندر تنظیم ہرگز پیدا نہیں ہوتی، نہ اعمال کے پائیدار اور مؤثر نتائج مرتب ہوتے ہیں اور نہ زندگی کی آسائشوں

سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ طبیعت اور اس کے تقاضے چونکہ وقت، جگہ اور حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لیے طبیعی تقاضے نہ انفرادی عمل میں مرکزیت اور یکسانیت پیدا کرسکتے ہیں اور نہ اجتماعی اعمال میں تنظیم پیدا کرسکتے ہیں۔ فرد اور جماعتوں کے اعمال میں اسی مرکزیت کو پیدا کرنے کے لیے اسلام نے انسان کو توحید کا عقیدہ دیا ہے۔ توحید سے ایمان ویقین میں مرکزیت پیدا ہوتی ہے اور یہ مرکزیت ہی اس کے اعمال میں تنظیم، یک جہتی اور یکسانیت کا سبب بنتی ہے۔

توحید

توحید کا عقیدہ اگرچہ آسمانی مذاہب کا ایک مشترک عقیدہ تھا، لیکن ان مذاہب کی پیروی کرنے والوں کے ذہن میں اس عقیدہ نے عجیب وغریب اور متضاد شکلیں اختیار کرلی تھیں۔ توحید کی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے کبھی اُس ایک ذات کو تمام صفات سے خالی اور معرا و معطل بتایا گیا اور کبھی اس کی صفات کو یا اُن صفات کی صورتِ ظہور کو مستقل آلہہ (معبود) بنادیا گیا۔ کبھی اس ایک ذات کو متعدد اجزاء وحصص میں تقسیم کردیا گیا اور کبھی متعدد حصص واجزاء کو ملاکر ایک مرکب ذات تیار کی گئی جو کبھی باپ، ماں اور بیٹا قرار دی گئی اور کبھی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ خاتم انبیاء ﷺ کے لائے ہوئے اسلام نے ''عقیدۂ توحید'' کو توحید کی ان پریشان تعبیروں سے یکسر پاک کیا اور انسانی ذہن سے وہ تمام توہمات دور کیے جو اہلِ مذاہب کے روحانی علماء اور مذہبی پیشواؤں نے پیدا کردیئے تھے، قرآن نے اعلان کیا کہ:

> ''اللہ کی جامع الصفات ذات ایک (اور اکیلی) ہے، اللہ کی ذات ہر چیز سے بے نیاز ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوئی، اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔'' (سورۂ اخلاص)

یہی توحیدِ خالص، درحقیقت انسانی اعمال کی بنیاد بن سکتی ہے اور یہی اس کی موت اور زندگی کا نصب العین۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

> ''آپ اعلان کردیجئے کہ میری نماز اور میری عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا حکم مجھے دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا سر جھکانے والا یعنی مسلمان ہوں۔''

اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف سے اعلان کرتے ہوئے قرآن کریم کا فرمان ہے:

> ''میں نے اپنا رخ ٹھیک ٹھیک اس ذات کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، میں کسی طرح بھی مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

اسلامی عقیدۂ توحید کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ کی ایک اور اکیلی ذات کے سوا کوئی مستحقِ

عبادت نہیں، بلکہ اس عقیدہ کا مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ کے سوائے نفع اور نقصان پہنچانے کی طاقت بھی کسی کو حاصل نہیں ہے۔عزت وعظمت، دولت وحکومت، موت وزندگی اور نفع وضرر کی مالک بھی وہی ایک ذات ہے۔

مساوات

نوعِ انسانی کے درمیان اعتقادی وحدت اور مرکزیت پیدا کرنے کے ساتھ ہی اسلام نے ان میں حقوق کی یکسانیت اور مساوات کے اعلان کے ذریعہ جماعتی تنظیم اور یک جہتی کی بنیاد بھی قائم کی، تاکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ مذہبی رہنماؤں اور حکمرانوں نے جو مادی قوت واختیار کے مالک ہوتے تھے، نوعِ انسانی کو مختلف طبقات اور گروہوں میں تقسیم کردیا تھا۔ رنگ، نسل اور خون کے فرق پر اُن کے حقوق تقسیم کردیئے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ رنگ ونسل کی وجہ سے خودکو خدا کی طرف سے قوت وحکومت کا مالک سمجھتا تھا اور دوسرے لوگ اس کی غلامی ومحکومی کی مبارک میراث کے نسلی طور پر وارث چلے آتے تھے۔ مذہبی رہنما مذہبی احکام کے مالک سمجھے جاتے تھے، اپنی خواہش سے جس چیز کو چاہتے حلال کرتے اور جس کو چاہتے حرام قرار دے دیتے، اور اپنی مرضی سے خدا کے غضب اور رضامندی کو تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اسلام نے اس فکری اور عملی شرک کا خاتمہ کیا، اس نے انسانوں کے درمیان مساوات کا اعلان کرتے ہوئے ہدایت کی کہ:

''اے انسانو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو صرف اس لیے قبیلہ اور گروہوں میں بنایا ہے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں سے زیادہ شریف اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہے۔'' (قرآن)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

''لوگو! تمہارا پروردگار بھی ایک ہے اور تمہارا (پہلا) باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے بنا ہے۔ کسی بھی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے، ہاں! پرہیزگاری کی وجہ سے فضیلت ہے، (جو جتنا زیادہ پرہیزگار ہے اتنا ہی افضل ہے)۔''

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''انسان کنگھی کے دانتوں کی طرح سب برابر ہیں۔''

انسانی حقوق کی اس مساوات نے جو ''ایک پروردگار'' کی مخلوق اور ''ایک باپ کی'' نسل ہونے کے عقیدہ کا نتیجہ تھی، انسانوں کے درمیان ربط اور تعلق کو زیادہ مستحکم اور مساوی بنیادوں پر قائم کیا اور ان کے فرائض وواجبات میں یکسانیت پیدا کرکے ان میں ایک محکم وحدت ومرکزیت اور تنظیم قائم کی۔

مساواتِ حقوق کے نتائج

عقیدۂ توحید اور فرائض وحقوق کی تحدید ومساوات نے انسانی عظمت ورفعت تک پہنچنے کے لیے راہ ہموار کردی۔ نسلی اور طبقاتی تقسیموں کو مٹا کر روحانی اور عملی قدروں کو عزت وشرف کا معیار ٹھہرایا، اور کسی امتیاز کے بغیر ہر فرد کے دل میں اس کمالِ انسانی کو حاصل کرنے کی تحریک اور عزم وولولہ پیدا کردیا جو انسانی زندگی اور اس کی جد وجہد کا حقیقی نصب العین ہے۔ اسلام کے اعلان کیے ہوئے اس عقیدہ نے کہ: ''حکم خدا کے سوا کسی کا نہیں ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔'' ایک طرف حکومت اور قانون پر انسانوں کے غیر مسئول اختیار کو محدود کیا اور دوسری طرف مذہبی علماء سے حلال وحرام کے اختیار کو چھین کر ان کو اللہ اور رسول (ﷺ) کے احکام کا محض مبلغ اور شارح قرار دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے سب سے پہلے خلیفہ نے حکومت کا اختیار سنبھالنے کے بعد ہی اعلان کیا کہ:

> ''مجھے تم پر والی بنایا گیا ہے، مگر میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر برے کام کروں تو مجھے راہِ راست پر لاؤ۔''

اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ کی کتاب اور رسول (ﷺ) کے ارشادات سے احکام کی تشریح کرنے والوں نے مذہبی احکام کی تعبیر وتشریح کے سلسلہ میں اپنے کسی شخصی اختیار کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ علم کتاب وسنت اور استخراجِ احکام واجتہاد کے باوجود ان کا یہ عقیدہ تھا کہ احکام کی تفصیل وتشریح میں غلطی ناممکن نہیں ہے۔ جہاں تک ان کے علم اور جد وجہد کا تعلق ہے وہ صحیح نتائج تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان اجتہادی وتشریحی مسائل کو کتاب وسنت کے صریح احکام کی سی قطعیت حاصل نہیں ہے۔ سلامی توحید ومساوات کی یہ واضح شاہراہ تھی جس نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ روئے زمین کے انسانوں کو اس تنگ دائرہ سے نجات دی، جو مذہب وحکومت کی جابر قوتوں نے ان کے گرد قائم کردیا تھا۔ اس شاہراہ پر چل کر نہ صرف مسلمانوں نے دنیا کی نئی اور ترقی پذیر تنظیم قائم کی، بلکہ دنیا کی تمام قوموں اور آنے والی نسلوں کے لیے کمال اور ترقی تک پہنچنے کی راہیں کھول دیں۔ کیا یہ وحدتِ یقین اور عملی مساوات کی مرکزیت آج بھی نوعِ انسانی کے لیے مشعلِ راہ نہیں ہے؟ قوموں کے باہمی تعاون اور بقائے باہمی کے لیے کیا اس سے زیادہ بہتر اور پائیدار کوئی اور بنیاد ہوسکتی ہے؟

۳-حریت واستقلال

انسانی آزادی اور اس کی حدود

حریت واستقلال یعنی انسانی آزادی اور اس کے مستقل ہونے پر دو حیثیتوں سے بحث کی جاتی

ہے: ایک انسان کے ارادہ اور فعل کی آزادی، یعنی یہ کہ انسان اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے آزاد اور مختار پیدا کیا گیا ہے یا وہ کسی بالاتر طاقت اور اس کی قدرت کے تحت اپنے ارادہ وافعال میں مسلوب الاختیار اور مجبورِ محض ہے۔ علوم وفنون کی اصطلاح میں یہ بحث مسئلہ ''تقدیر'' یا ''جبر واختیار'' کی بحث کہی جاتی ہے اور علمِ عقائد وکلام کی مشکل ترین بحثوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس مسئلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبویہ میں صاف طور پر اعلان کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ومختارِ مطلق ہے، انسانی ارادہ اور افعال بھی اسی کی قدرت کے تحت داخل اور اسی کی مشیت کے تابع ہیں۔ کوئی چیز اللہ کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کرسکتی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان بھی نباتات وجمادات اور دوسری بے جان چیزوں کی طرح بے اختیار ومجبورِ محض ہے، بلکہ ایک محدود دائرہ میں جو ''اختیار'' اس کو دیا گیا ہے اس میں اور جتنی قوتیں اس کو دی گئی ہیں ان کے استعمال میں کوئی مداخلت عموماً نہیں ہوتی۔ خیر وشر اور طاعت ومعصیت کی دوراہوں میں سے جب وہ کسی ایک راہ کو -خواہ خیر ہو خواہ شر- اپنی خواہش وارادہ کے تحت اختیار کرلیتا ہے تو اس کی قدرت اس کو دے دی جاتی ہے اور اسباب اس کے ارادہ کے موافق کردیئے جاتے ہیں اور اس کے مطابق افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں اور اسی اختیار پر دنیوی واُخروی جزا وسزا کا مدار ہے۔

غرض انسان کی اسی محدود آزادی اور دیئے ہوئے اختیار پر اس کی تمام ذمہ داریاں موقوف ہیں۔ اسی دائرہ میں اس کی آزمائش ہوتی ہے، اس پر ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں، مکلف بنایا جاتا ہے اور اس سے مطالبات کیے جاتے ہیں۔ اسی محدود اختیار وارادہ کی وجہ سے اس کی ہدایت ورہنمائی کے لیے دین وشریعت، کتابیں اور پیغمبر بھیجے گئے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

''اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا''

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط (اور مرد وعورت کے مرکب) پانی سے پیدا کیا، تاکہ ہم اس کو آزمائیں (اسی لیے) ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے (سوچنے اور سمجھنے) والا بنایا، ہم ہی نے اس کو راستہ دکھایا، اب وہ شکرگزار بنے چاہے ناشکرا۔''

اور فرمایا:

''اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔''

''کیا ہم نے اس کے دو آنکھیں (ایک) زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے؟ اور ہم نے اس کو دونوں کھلے ہوئے راستے (اچھائی اور برائی) بتلا دیئے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

’’وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ‘‘

’’نفس انسانی کی قسم اور اس کو ٹھیک ٹھیک (موزوں) بنانے کی قسم! پھر اس کو اس کی بدکاری اور پرہیزگاری سمجھا دی۔‘‘

غرض اپنی فطری قوتوں کے لحاظ سے انسان کی اسی محدود آزادی اور اختیار پر دین، شریعت اور قانون کی ذمہ داری اور جزا وسزا کا مدار ہے۔ اس کی ارادی اور اختیاری زندگی کا تمام ڈھانچہ ’’اسی حریت‘‘ اور ’’استقلال‘‘ کی بنیادوں پر قائم ہے۔ حریت اور استقلال کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ فرد کی شہری یا جماعتی آزادی کی حدیں کیا ہیں؟ جماعت کو افراد پر کس حد تک اختیار حاصل ہے؟ اور افراد اپنے افعال میں کس حد تک آزاد ومختار ہیں؟ اس لحاظ سے سوال علم الاجتماع اور علم السیاست کا ایک علمی وعملی مسئلہ بن جاتا ہے اور نئے دور کے تمام نزاعی مسائل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہے۔

تاریخی سوال

انسان کی مجلس اور سیاسی آزادی کی یہ بحث کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ اتنا ہی پرانا سوال ہے جتنی کہ انسان کی تمدنی اور اجتماعی تاریخ قدیم ہے۔ انسان اپنی نفسیاتی اور طبعی ساخت اور ضروریات کی وجہ سے اپنی نوع کے بہت سے افراد کے ساتھ مل کر رہنے پر مجبور ہے۔ یہ ’’ضرورت‘‘ ایک ایسے نظام کی محتاج ہے جس میں افراد کی عملی حدیں مقرر ہوں اور ایک ایسی قوت بھی موجود ہو جو افراد کو ان مقررہ حدوں سے نہ گزرنے دے۔ آزادی اور اقتدار کی یہ کش مکش ہی دراصل اس اہم سوال کا منشا ہے کہ فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات کن خطوط پر قائم ہوں۔ افراد کے حقوق اور جماعتی اختیار کی حدیں کیا مقرر کی جائیں؟ انسانی تمدن واجتماع کی تاریخ قدیم ترین زمانہ سے انہیں منصفانہ حدود کو تلاش کر رہی ہے۔ کبھی حکمراں قوت کو اختیارات کا سرچشمہ سمجھ کر افراد کو اس کے ظلم اور زیادتی سے بچانے کے لیے افراد کے حقوق مقرر کیے جاتے ہیں اور کبھی افراد یعنی جمہور کو اختیارات کا مالک بنا کر حکمراں طاقت کی نوعیت، تنظیم اور ساخت اور اس کے اختیارات کی صورتیں اور حدیں مقرر کی جاتی ہیں۔ انہیں تجربات نے انسان کو ’’حکومتِ خود اختیاری‘‘ کے نظریہ تک پہنچایا ہے، یعنی افراد کی اپنی مرضی سے خود اپنے اوپر حکومت۔

حدود وحقوق کا تحفظ

اس نظریہ کے تحت افراد اور حکومت یا جماعت کے درمیان حد بندی کے مسئلہ کو ختم ہوجانا چاہیے تھا، لیکن یہ تجربہ بھی اس مشکل کا حل تلاش نہ کرسکا۔ اختیارات کو استعمال کرنے والے ادارے اور زیرِ اختیار افراد

کے مفاد چونکہ ہمیشہ متصادم ہوتے ہیں، اس لیے افراد کی آزادی اور حقوق کا مسئلہ پھر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ حکمراں اکثریت اور اقلیت کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ اکثریت کی صرف عملی زیادتیوں کے خلاف ہی نہیں، اس کے ذہنی اور فکری استبداد کے خلاف بھی تحفظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جیسا کہ دنیا کے متعدد حصوں میں آج یہ ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ آج بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ انفرادی آزادی اور جماعت کے اختیارات کے درمیان کس طرح مطابقت پیدا کی جائے؟ اور کہاں ان کی حدیں مقرر کی جائیں؟ اور کمزور لوگوں کو کس طرح طاقتور لوگوں کے سیاسی اور فکری استبداد سے محفوظ رکھا جائے؟

ان مشکلات کے حل کے لیے ''نئے مفکرین'' اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لوگوں کے افعال پر چند قواعد وضوابط کے ذریعہ پابندیاں عائد کرنا ضروری ہے۔ یہ قواعد وضوابط قانون کے تحت اور رائے عامہ کے ذریعہ بنائے جائیں۔ بالفاظِ دیگر چند بنیادی اصول کے ذریعہ افراد کے فکر اور عمل کو ایک خاص رخ پر موڑنا اور قانون یا رائے عامہ کے ذریعہ ان پر پابندیاں عائد کرنا اجتماع اور نظم کی بنیادی ضرورت ہے اور افراد کی آزادی اور جماعت یا حکومت کے اختیارات کے درمیان حدیں قائم کرنے کے لیے یہی رہنما اصول ہے۔

یہ بنیادی اصول کیونکر وضع کیے جائیں؟ ان کی نوعیت کیا ہو؟ شخصی اور طبقاتی رائے، جذبات وخواہشات، پسند ناپسند اور ان مقامی رسم ورواج سے بلند ہوکر (جو لوگوں کی فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں) محض عادلانہ انسانی منافع اور منصفانہ مصالح کو ان اصول میں کس طرح پیش نظر رکھا جائے؟ کون ان کو وضع کرے؟ اور ''حکمراں ادارہ'' کی تشکیل سے پہلے کونسی قوت ان کو عمل میں لائے؟ ان سوالات کا کوئی محفوظ اور قابلِ اطمینان حل ابھی تک دریافت نہیں کیا جاسکا۔

اسلامی حل

اسلام نے اجتماعِ انسانی کی اس مشکل کو نہایت حکیمانہ انداز میں حل کیا ہے۔ اس نے افراد کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا کہ وہ خود اپنی پسند سے اپنی فکری اور عملی رہنمائی کے لیے بنیادی اصول مقرر کریں یا خود اپنی آزاد مرضی سے جس طرح چاہیں اپنے اوپر حکومت قائم کریں اور جہاں چاہیں فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کی حدیں قائم کریں، اس لیے کہ انسان اپنی ذاتیات سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اپنی پسند، اپنی شخصیت اور گردوپیش کے اثرات سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اپنی اصل فطرت کے تنوع کے لحاظ سے بھی اور شخصی خواہشات ومفادات کے اختلاف وتضاد کی بنا پر بھی وہ ایسے اصول وضع کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ موزوں نہیں ہے جو پوری انسانی وحدت کے لیے یکساں فائدہ مند ہوں، بلکہ یہ اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے کہ اپنی شخصیت سے کبھی الگ نہیں ہوسکتا۔ اسلام نے انسانی اجتماع کے لیے چند بنیادی اصول ''مالک الملک'' اور

’’احکم الحاکمین‘‘ کے بتلائے ہوئے مقرر کیے جو ان تمام نقائص سے پاک و برتر ہے۔ اسی خالقِ کائنات کی رہنمائی سے افراد کے فکر و عمل کی سمتیں مقرر کیں۔ ایمان ویقین کی قوت کو ان اصول اور پابندیوں کا نگران بنایا۔ افراد کے حقوق اور فرد و جماعت کے باہمی تعلق کی حد بندی کی اور اس کے بعد اعلان کر دیا کہ:

’’جو کوئی اللہ کی مقرر کی ہوئی ان حدوں سے تجاوز کرتا ہے وہ ظالم ہے۔‘‘

’’بنیادی اصول‘‘ کی اس ایک بالادستی کو تسلیم کرانے کے بعد اسلام نے نہ کسی نبی کو یہ حق دیا کہ وہ اللہ کے علاوہ اپنی خواہش اور مرضی کا لوگوں کو پابند بنائے، نہ کسی حکمراں قوت کو۔ اس نے افراد کی اس آزادی کا صاف صاف اعلان کیا کہ: ’’اللہ کی نافرمانی کرنے کے لیے کسی مخلوق کی فرمانبرداری نہیں کی جاسکتی۔‘‘ حکومت اور جماعت کی فکری اور عملی زبردستی سے کمزوروں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے ضمانت دی کہ: ’’دین میں زبردستی نہیں ہے۔‘‘ اس نے جماعت کو متنبہ کیا کہ: ’’کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی کا مجرم نہ بنادے۔‘‘ اسلام کی دی ہوئی انفرادی آزادی کی ایک شاندار مثال ہی ہے، جس نے نہ صرف حکومت اور فرد یا جماعت اور فرد کے باہمی تعلق کی راہ میں سنگِ میل نصب کیا ہے، بلکہ جمہوری اور عوامی تصورِ زندگی کے لیے بھی وہ ایک نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے، جبکہ مصر کے ایک مسلمان ’’گورنر‘‘ کے خلاف محکوم اور کمزور قبطی کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا تھا کہ:

’’متٰی استعبدتم عبادَ الله؟ وقد ولدتهم أمهاتُهم أحرارا؟‘‘

’’تم نے اللہ کے بندوں کو کب سے اپنا غلام سمجھ لیا ہے؟ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد پیدا کیا تھا۔‘‘

یہ ہے حریت واستقلال کا وہ اسلامی تصور جس نے موجودہ دور کے تصورِ آزادی کی رہنمائی کی ہے، اور جس کو آج بھی انسانی آزادی کی راہ میں ایک مثال اور نصب العین کی حیثیت حاصل ہے۔

تحفظ کے وسائل

انسانی آزادی اور حدود وحقوق کی ان حد بندیوں کے درمیان کسی نظام کو قائم کرنے اور باقی رکھنے کے لیے عموماً طاقت کے مادی سہارے یعنی ’’حکومت‘‘ کو کافی سمجھا جاتا ہے اور اس حکمراں طاقت کو حاصل کرنے کے اسباب اور ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں اور جب یہ طاقت حاصل ہوجاتی ہے تو ایک نظام یا اصول قائم اور جاری کر دیا جاتا ہے، خواہ لوگوں کے ذہن اس انتظام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ اس طاقت کے سہارے قائم ہونے والے نظام کا انجام عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس کی جڑیں قوم کے دلوں میں جگہ نہیں پکڑتیں اور جیسے ہی قوت کا سہارا کمزور ہوتا ہے، اس نظام کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور زندگی کی ساری تعمیر زمین پر آرہتی ہے۔

اسلام نے اپنے نظام کو قائم کرنے کے لیے محض مادی قوت اور حکمراں طاقت کے سہارے کو ہی استعمال نہیں کیا، بلکہ اس نے اپنے جامع نظام کو قائم اور دیرپا رکھنے کے لیے ایک جامع اور محکم روحانی اسکیم تیار کی۔ اس نے قوت کے ظاہری اسباب سے زیادہ داخلی قوتوں کی تنظیم پر زور دیا اور مادی طاقت کو دوسرے درجہ کی اہمیت دی، اس نے سب سے پہلے چند حقیقتوں پر ایمان ویقین کی دعوت دی۔ ان حقیقتوں پر ایمان کے ذریعہ خود انسان کے ضمیر میں اپنے اعمال کی ''جوابدہی'' کا احساس پیدا کیا اور اس احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ''ایمان ویقین'' کے پیدا کیے ہوئے ''عمل'' کو انسانی شرف اور بندگی کا معیار قرار دیا۔ اسی ''عمل'' پر ان کریمانہ اخلاق کی بنیاد قائم ہوئی جو کسی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے ایک اہم معنوی قوت ثابت ہوتی ہے۔

عقیدہ وعمل میں مرکزیت قائم کرنے کے لیے اسلام نے توحید کا عقیدہ دیا جو انسانوں میں ذہنی یک جہتی اور وحدت قائم کرنے کی ایک داخلی اور ذہنی قوت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''انسانی مساوات'' کا اصول پیش کیا جو عملی مرکزیت باقی رکھنے کے لیے ذہنی اور اعتقادی قوت ہونے کے علاوہ مشترک ''عمل'' اور مشترک ''فائدہ'' حاصل کرنے کے لیے ایک پرکشش عملی تحریک بھی ہے جو ''اجتماعی عمل'' کے لیے اُبھارتی ہے۔

زندگی کے لیے یقین وعمل کی بنیادیں، توحید ومساوات کے زریں اصول اور اعتقادی وعملی تحریکیں استوار کرنے کے بعد اجتماعی جد وجہد اور تعاون کو منظم کرنے کے لیے اسلام نے فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک اور سلسلہ قائم کیا ہے جو اپنے نتائج اور اثرات کے لحاظ سے ایک خارجی تنظیم اور قوت پیدا کرتا ہے اور کسی نظام کو قائم کرنے اور اس کو باقی رکھنے میں ایک اہم ''مؤثر'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ان فرائض میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اہم فریضہ ہے۔

امر بالمعروف کا مقصد یہ ہے کہ اللہ نے جن امور کو انسانی زندگی کی خیر وخوبی اور نیکی قرار دیا ہے ان کی ترغیب دی جائے۔ نہی عن المنکر کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں کو انسانی زندگی کے لیے ناپسندیدہ، ضرررساں اور ''برائی'' بتایا گیا ہے، اس سے روکا جائے۔ قرآن کا حکم ہے کہ:

> ''اللہ انسانوں کو عدل وانصاف قائم کرنے، احسان کرنے اور قرابت داروں کو ان کے حقوق دینے کا امر فرماتا ہے، فحش اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتا ہے۔''

قرآن کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا مقصد اللہ تعالیٰ کے اُنہیں احکام کو پہنچانا اور جاری کرنا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ: ''جو لوگ اُس رسول اور نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کے آنے کی بشارت ان کے پاس توریت اور انجیل میں لکھی ہوئی موجود ہے اور جو ان لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے ان کو روکتا ہے۔ پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور گندی چیزوں کو ان پر

حرام کرتا ہے۔ ان کے سروں سے وہ ''بوجھ'' (اور ظلم واستبداد کی ان بیڑیوں کو) دور کرتا ہے جو ظالم اور جابر طاقتوں نے ان پر لگا دی تھیں۔ اب جو لوگ اس رسول پر ایمان لے آئے اور اس کی نصرت وحمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس نورِ ہدایت یعنی قرآن کی پیروی کرنے لگے جو اس رسول کے ساتھ بھیجا گیا تھا، وہی لوگ درحقیقت فلاح اور کامیابی پانے والے ہیں۔'' پھر یہ امر بالمعروف، امرِ الٰہی اور مقصدِ رسالت ہی نہیں، یعنی صرف اللہ اور اس کے رسول کا کام ہی نہیں ہے، بلکہ مومنوں کا بھی ایک ''فرضِ عام'' ہے جو اسلام کے نظامِ اخلاق ومعاشرت قائم کرنے میں اللہ اور رسول (ﷺ) کے قائم مقام اور ان کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس فرضِ عام کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا کہ:

''اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔''

''مسلمان وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں صاحبِ اقتدار واختیار بنادیں تو وہ نماز کو قائم کریں، مال کی زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیں۔''

ایک اور موقع پر مومنین کی امتیازی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی ساتھی ہیں۔ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا۔''

قرآن حکیم کی ان ہدایات سے واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں کا ایک اہم اور عام فرض ہے اور صرف ایسی حالت ہی کے لیے مخصوص نہیں، جبکہ مسلمانوں کو بحیثیت جماعت کسی حصۂ زمین میں قوت اور طاقت حاصل ہو، بلکہ ایسا فرض ہے جو ہر زمانہ میں اور ہر حالت میں ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''تم میں سے ہر شخص راعی اور نگراں ہے اور اپنی زیرِ نگرانی رعیت کے متعلق جوابدہ ہے۔''

یہ فریضہ اسلام کی حقیقی روحِ اُخوت ومساوات کا تقاضا ہے اور اسلامی نظام کی اُس عظیم الشان رحمت وبرکت کا براہِ راست نتیجہ ہے جو انسانی اور اسلامی برادری کے لیے عام کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''دین خیرخواہی اور ہمدردی کا نام ہے۔''

اہلیتِ امر ونہی

دوسرے فرائض کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھی صرف انفرادی صلاحیت ہی ضروری شرط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

''تم میں سے کوئی شخص اگر کسی برائی کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھوں سے (یعنی طاقت کے ذریعہ) بدل دے۔ جس کو ہاتھوں سے بدلنے کی طاقت نہ ہو وہ اپنی زبان سے اس کو بدل دے، یعنی قوتِ بیان اور افہام تفہیم کے ذریعہ اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو اپنے دل سے تو اس کو ضرور برا سمجھے (یعنی اپنے طرزِ عمل سے اپنی بیزاری کا اظہار کرے) اور یہ تو ایمان کا کمزور سے کمزور درجہ ہے۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس اہم اصول نے (جو اسلامی عقائد کا نتیجہ اور مسلمانوں کا ایک عملی فریضہ ہے) نہ صرف اسلامی نظام کے قائم کرنے اور اس کے باقی رکھنے میں اہم حصہ لیا ہے اور سیاسی طاقت (حکومت) کی کمزوری کی حالت میں اس نظام کو اور معاشرہ کو اندرونی اور بیرونی تخریبی قوتوں اور برائیوں سے بچایا ہے، بلکہ اس نے پرانی دنیا کو جو محض ایک اندھی اور بے رحم مادی طاقت پر یقین رکھتی تھی ترقی کی ایک نئی راہ دکھائی ہے، اس اصول نے انسانی معاشرہ کی تعمیر میں طاقت اور قوت پر اعتماد کرنے کی بجائے عوام کو اپنے اعتماد میں لینے اور ان کے علم ویقین کو تعمیر کرنے اور کارفرما بنانے کی طرف رہنمائی کی ہے اور اس طرح انسان کے روحانی اور مادی ارتقا میں ایک اہم اور نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ مخلوق کو نیکی اور بھلائی کی طرف بلانے اور برائیوں سے روکنے کے فرض سے غفلت ہی نے ہماری معاشرتی تنظیم میں تمام تر رخنے ڈالے ہیں اور اس کو تباہ کیا ہے اور اندرونی وبیرونی تخریبی قوتوں کو سَر اُبھارنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

تعلیم وتبلیغ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو علم ہی کے ذریعہ اس کو اپنی دوسری مخلوق پر حتیٰ کہ فرشتوں پر بھی فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور فرشتوں کی مقدس مخلوق کے سامنے اس کی اس فضیلت کا اظہار فرمایا اور اسی فضیلتِ علم کی وجہ سے اس کو خلافتِ الٰہیہ کا مستحق ٹھہرایا اور تمام کائنات پر اقتدار اور تصرف کی قوت سے سرفراز فرمایا، اس لیے علم ہی درحقیقت انسانی فضل وشرف کی بنیاد ہے۔

علم کی وجہ سے اس کو خلافتِ الٰہیہ کا مستحق ٹھہرایا اور تمام کائنات پر اقتدار اور تصرف کی قوت سے سرفراز فرمایا، اس لیے علم ہی درحقیقت انسانی فضل وشرف کی بنیاد ہے۔

انسانی طبیعت میں علم ومعرفت اور حقائقِ اشیاء کے معلوم کرنے کی تڑپ پیدا کرنے کے بعد اللہ نے اس کو زندگی کی راہوں میں بھٹکنے کے لیے تنہا اور بے سہارا نہیں چھوڑا، بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے انہیں میں سے کچھ ایسے افراد بھیجنے کا سلسلہ قائم کیا، جو اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے کمالِ انسانی کے درجات پر فائز ہوتے اور اللہ کے دیے ہوئے علم ومعرفت اور حکمت وہدایت کو عام انسانوں تک پہنچاتے تھے اور ان کی

رہنمائی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ کمالِ انسانی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو تعلیم دینا اور اللہ کے احکام کو اس کے بندوں تک پہنچانا ان مقدس افراد کا فریضہ تھا جو دینی اور مذہبی اصطلاح میں ''پیغمبر'' کہلاتے ہیں۔

نوعِ انسانی کے قافلے نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی میں اپنی اپنی منزلوں تک سفر کرتے رہے اور قوموں اور گروہوں کی صورت میں اس آخری سفر کے لیے تیار ہوتے رہے جو انہیں اجتماعی طور پر ایک ''نبی کامل'' کی رہنمائی میں تکمیلِ انسانیت کے لیے کرنا تھا۔ جب انسانیت کا وہ آخری رہنما آیا جس کے بعد کوئی نبی اور رسول آنے والا نہ تھا تو اس نے اعلان کیا کہ:

''میں معلمِ انسانیت بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اخلاقی بزرگیوں کی تکمیل کروں۔''

اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اس دعوے کی شہادت دیتے ہوئے بندوں پر اپنے اس مخصوص کرم واحسان کا اظہار فرمایا۔ اللہ وہ ہے جس نے بے پڑھے لکھے (علم ومعرفت سے نا آشنا) لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں کتاب وحکمت اور شریعتِ الٰہیہ کی تعلیم دیتا ہے اور ان میں پاکیزگی پیدا کرتا ہے۔ سچائی کی تعلیم اس نبیِ کامل کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی اور اس سچائی کو دوسروں تک پہنچانا اس کے منصب کا سب سے اہم فریضہ تھا۔ اللہ نے اس فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ:

''اے نبی! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ اُتارا گیا ہے اس کو دوسروں تک پہنچادو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا (یعنی رسول کی حیثیت سے فرضِ تبلیغ انجام نہیں دیا)۔''

تعلیم وتبلیغ کی اسی اہمیت کی وجہ سے اسلام نے اپنی تعلیمات میں علم حاصل کرنے اور اس علم کو دوسروں تک پہنچانے پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ قرآن نے اولین خطاب میں رسول اللہ ﷺ کو علم کی طرف متوجہ کیا اور انسان کے سامنے سب سے پہلے اللہ کی اس نعمتِ عظیم کا اظہار فرمایا کہ:

''(اے نبی!) اپنے اس پروردگار کا نام لے کر (خدا کا کلام) پڑھو، جس نے (تمام کائنات کو) پیدا کیا ہے۔ (خاص کر) جس نے انسان کو گوشت کے ایک ٹکڑے سے پیدا کردیا۔ (اس کا کلام) پڑھو! اور تمہارا بزرگ ترین پروردگار تو وہ ہے جس نے قلم کے ذریعہ (لکھنے پڑھنے کی) تعلیم دی اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔''

پھر یہ صرف رسول ہی کا فریضہ نہیں تھا کہ وہ حق وصداقت کے اس الہامی علم کے پھیلانے کی جدوجہد کریں جو اُن کو دیا گیا تھا اور جس کو عام کرنا اُن کی رسالت کا مقصد قرار دیا گیا تھا، بلکہ رسول ﷺ پر ایمان لانے والوں کے لیے بھی علم حاصل کرنا اور اس علم کو دوسروں تک پہنچانا فرض قرار دیا گیا ہے۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے، علم حاصل کرو چاہے وہ چین (ماچین) میں ہو۔ جو علم کی طلب میں نکلا وہ اللہ کی راہ کا مجاہد ہے۔''

اسی طرح اور بہت سی احادیث میں آپ نے علم اور علماء کی فضیلت بیان فرما کر مسلمانوں کو ''پیغمبروں کی میراث''، یعنی علم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اور علم حاصل کرنے کے بعد اس کو دوسروں تک منتقل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''مجھ سے (سنی ہوئی آیات واحادیث) دوسروں کو پہنچاؤ، چاہے ایک ہی آیت (یا حدیث) ہو۔''

ان لوگوں کے لیے آپ نے خاص طور پر دعا فرمائی ہے، جو علومِ نبوی کو دوسروں تک پہنچائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''خدا اس کو سرسبز رکھے جس نے ہم سے جو کچھ سنا اس کو جیسا سنا ویسا ہی دوسروں تک پہنچادیا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اُمت کے اس فرضِ ''تعلیم وتبلیغ'' کی طرف توجہ دلاتے ہوئے حجۃ الوداع کے آخری خطبۂ نبوت میں اپنا فرضِ تعلیم وتبلیغ انجام دینے پر اُمت کو گواہ بنایا اور ان کو اس فریضہ کے انجام دینے کی تاکید فرمائی کہ:

''جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں تک (دینِ الٰہی) پہنچادیں جو موجود نہیں ہیں (یعنی ہر نسل دوسری نسل کو اور اگلے پچھلوں کو قیامت تک اسی طرح دینِ الٰہی پہنچاتے رہیں)۔''

اسلامی علوم

اسلام نے جن علوم کو حاصل کرنے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے پر زور دیا ہے، ان میں قرآن وحدیث اور ان کے مددگار علوم کے ساتھ ساتھ وہ تمام علوم بھی شامل ہیں جن کو حاصل کرنے کی اور ان میں غور وفکر کرنے کی قرآن وحدیث مین دعوت دی گئی ہے۔ بعض علماء نے ایسے علوم کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے جن کا سرچشمہ خود قرآنی آیات ہیں اور بعض اہلِ تحقیق کا خیال ہے کہ دنیا کا کوئی علم بھی قرآن کے اس وسیع دائرۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ ان میں سے بعض علم ضروری ہیں اور بعض زائد از ضرورت۔ ضروری علوم کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: علم تین ہیں: آیت محکم یعنی قرآن حکیم سے متعلق علوم۔ سنتِ قائمہ یعنی صحیح احادیث سے متعلق علوم اور فریضۂ عادلہ یعنی زندگی کے صحیح فرائض سے متعلق علوم، جن کی مدد سے انسانی زندگی کے لیے صحیح راہ متعین کی جاسکے۔ اس آخری قسم میں تمام اِفادی علوم شامل ہیں۔ علوم کی ان تین صنفوں کے علاوہ تمام علوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''فضل''، یعنی زائد از ضرورت قرار دیا ہے اور

ان میں وہ تمام فنون شامل ہیں جو انسان کو اپنے مقصدِ زندگی سے غافل کر دیں۔

اسلام نے اپنے اصولِ دعوت میں ''تعلیم وتبلیغ'' کو جو اہمیت دی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے دنیا کی تمام قوموں میں تعلیم اور تبلیغ کے علمبر دار بنے، یہی قرآن حکیم کا منشا تھا، ارشاد ہے:

''تم بہترین امت ہو جس کو لوگوں (یعنی دنیا کی قوموں کی رہنمائی) کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تمہارا کام (خدا رسول کے نزدیک) معروف اچھے امور کا حکم دینا اور منکر (برے کاموں) سے منع کرنا۔''

مسلمانوں نے نہ صرف دینی علوم کی نشر واشاعت کی، بلکہ ان ''روایتی'' علوم کے ساتھ ''عقلی'' علوم کو بھی کافی اہمیت دی۔ انسانیت کے لیے مفید اور کار آمد نئے نئے علوم ایجاد کیے اور دنیا کو ان علوم کی روشنی سے فائدہ پہنچایا۔ نوعِ انسانی اپنے علم اور تجربہ کے محدود سرمایہ کو گمراہ کن خواہشوں کے انبار میں چھپائے ہوئے بھٹک رہی تھی۔ مسلمانوں نے انسانیت کے اس سرمایہ کو قوموں اور گروہوں کی اجارہ داری سے نکالا اور پوری انسانیت کے لیے عام کر دیا۔ وہ علم جو طبقات اور گروہوں کی میراث بن چکا تھا اور جس کو نسل ومقام کی قیدوں میں محصور رکھا گیا تھا، اب وہ تمام انسانوں کے لیے عام ہو گیا اور اسلامی درس گاہیں دنیا کی قوموں کو تحصیلِ علوم وفنون کی صلائے عام دینے لگیں۔ مسلمان ہی تھے جو اس عالم گیر علمی تحریک کے بانی بنے، جس نے موجودہ دنیا کو علم وتحقیق اور ایجاد واختراع کا ذوق بخشا اور علمی ترقیات کی طرف رہنمائی کی۔

افسوس! آج علم پھر جغرافیائی حدود میں محصور کیا جا رہا ہے۔ تجربات اور ایجادات چھپائے جا رہے ہیں، تاکہ وہ خاص نسلوں اور مخصوص قوموں کی محفوظ اور مخصوص میراث بن جائیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آج علم نوعِ انسانی کے لیے زندگی کی مستقیم شاہراہ متعین کرنے کی بجائے نسلی اور قومی برتری قائم کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا ہے، اور اس لیے اب وہ روشنی اور سکون واطمینان پیدا کرنے کی بجائے عام دنیا کے لیے تاریکی اور خوف وہراس پیدا کرنے کا سبب اور عالمگیر بدامنی اور سرد وگرم لڑائیوں کا ذریعہ بن گیا ہے۔

خوف اور دہشت کی اس دنیا میں اپنی تعلیمی اور تبلیغی جد وجہد کے ذریعہ کیا مسلمان ایک مرتبہ پھر علم ومعرفت کا چراغ روشن کریں گے؟ اور نوعِ انسانی کو امن واطمینان کی دولت فراہم کریں گے؟

خدا کرے مسلمانوں کو اپنا بھولا ہوا سبق اور چھوڑا ہوا فرض یاد آ جائے اور وہ اس کو انجام دینے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں!! ''لن يصلح آخرُ هٰذه الأمة إلا بما صلح أولها.'' اس امت کے آخر کو سدھارنے والی صرف وہی چیزیں وتدبیریں ہوں گی جنہوں نے اس کے اول کو سدھارا ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

مملکتِ خداداد میں

سدومیت کی راہیں ہموار کرنے کی تدبیریں

مولانا محمد طفیل کوہاٹی

ٹرانس جینڈر ایکٹ پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا، اس کی قانونی تشریح کرنے والے ماہرین بھی اس پر تقریباً متفق ہیں کہ اس ایکٹ کی آڑ میں ہم جنس پرستی کا دروازہ کھولنے کی گھناؤنی سازش رچائی گئی ہے۔ ذیل میں اس ایکٹ تک رسائی کی تاریخ اور اس سے پیدا ہونے والے مباحث کا مختصر تجزیہ پیشِ نظر ہے:

❶- وطنِ خداداد کو یکجا رکھنے کی اِکائی رنگ ونسل، قوم وزبان اور تہذیب وثقافت سے ماوراء ہے، یہ اکائی ''دینِ اسلام'' ہے، اگر معاشرے کی مذہبی شناخت قائم رہے گی تو یہ مملکتِ خداداد باوجود انتظامی وسیاسی شکست وریخت کے دنیا کے نقشے پر پورے طمطراق سے دشمنوں کے سر پر سوار رہ کر باقی رہے گی۔ اگر خاکم بدہن معاشرہ اپنی مذہبی شناخت سے دستبردار ہونے کی راہوں پر گامزن ہو چلے تو اس ملک کو یکجا رکھنے کی کوئی اور اِکائی سرے سے موجود ہی نہیں۔ مملکتِ خداداد کی حفاظت پر مامور محافظین سمیت دانشور طبقہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھتا ہے کہ مملکتِ پاکستان کی تعمیر میں مذہبی معاشرے کا کردار ہی کلیدی نوعیت کا ہے۔ ہم آدھا ملک اسی لسانی وقومی شناخت کے لیے اتاؤلوں کے ہاتھ گنوا چکے ہیں اور اس وقت بھی ملک دشمن طاقتیں لسانی، قومی اور علاقائی عصبیت پر مبنی تحریکوں کے ذریعے اپنے مقاصد نکالنے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ تاہم یہ طاقتیں اس بات کا بھی اِدراک رکھتی ہیں کہ جب تک پاکستانی معاشرہ مذہب کی اخلاقی قدروں سے بالکلیہ آزاد نہ ہوا اُسے توڑنے کا عمل کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اخلاقی قدروں کی ریخت کا یہ سفر عرصہ سے جاری ہے۔ جاہلی عصبیت کا فروغ بھی اسی کا حصہ ہے، فحاشی وعریانی اور مادر پدر آزاد تہذیب کا چرچا بھی انہی مقاصد کی تکمیل کا زینہ ہے۔ ذرائع ابلاغ اور میڈیا کے ذریعے بے لباس ثقافت کی راہ ہموار کرنے اور معاشرتی اقدار کو توڑنے کے لیے مخصوص ڈراموں اور فلموں کا

رواج بھی اسی مہم جوئی کے تحت ہے، لیکن قانونی سطح پر ہم جنس پرستی کے لیے ٹرانس جینڈر ایکٹ کا جو تازہ کھیل کھیلا گیا ہے، یہ ہماری معاشرتی ودینی اقدار کے خلاف سب سے گہری وگھناؤنی سازش ہے۔

❷- خدا کی زمین پر ہم جنس پرستی کی لعنت کا سب سے پہلے پر چار کرنے والے اہلِ سدوم تھے۔ سدوم کی بستیوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام مبعوث ہوئے، قرآنی تصریح کے مطابق اہلِ سدوم سے قبل اس زمین پر کسی ابن آدم نے اس فعلِ بد کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔

پہلے پہل یہ چند اوباش طبع افراد کے جتھے کا عمل تھا جو راہ گزرتے مسافروں کو تنگ کرنے کی غرض سے اس قسم کے آوازے کستے۔ تاہم جب ایک بات قوم کی عام مجلسوں کا موضوع بن جائے تو اس کی سنگینی اور حساسیت کا تأثر رفتہ رفتہ ذہنوں سے مٹنے لگتا ہے، آج کا میڈیا بھی یہی کردار ادا کرتا ہے کہ قوم کے ذہنوں سے معصیت کی سنگینی کا احساس بتدریج مٹایا جائے۔ اس وقت کی یہ ضرورت شاید چوپالوں اور بیٹھکوں نے پوری کی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا یہ فعل انفرادی سطح پر نہیں رہا، بلکہ اسے معاشرتی جواز ملنے پر یہ قومی مرض بن گیا، یہاں تک کہ ان کی عادات میں اس قدر رچ بس گیا کہ ان کا نشہ بن گیا، جس طرح نشئی دور سے اپنے نشے کی بو سونگھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے یا نشہ کرنے والوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نشیانہ حس پھڑکتی ہے، بعینہٖ یہ دور سے اپنے مقصدِ غلیظ کی تکمیل کا موقع بھانپ لیتے تھے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں نیست و نابود کرنے اور زمین کو ان کی غلاظت سے نجات دینے کا فیصلہ کیا، اس وقت بطور آزمائش ملائکِ عذاب کو امارد کی شکل میں ان کی بستی میں بھیجا، قرآن کریم نے اس موقع پر ان کے رویے کی جو منظر کشی کی ہے، اس سے سدومی معاشرے کی اقداری سطح کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

''وَجَاءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ إِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئٰتِ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ۔''

ترجمہ: ''اور ان کی قوم ان کے پاس دوڑی ہوئی آئی اور پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے لوط (علیہ السلام) فرمانے لگے کہ: اے میری قوم! یہ میری (بہو) بیٹیاں موجود ہیں، وہ تمہارے (نفس کی کامرانی کے) لیے (اچھی) خاصی ہیں، سو اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھ کو فضیحت مت کرو، کیا تم میں کوئی بھی (معقول آدمی اور) بھلا مانس نہیں۔''

وہ حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پر چڑھ دوڑے، نہ لوط علیہ السلام کی نجابت سے شرم آئی، نہ اجنبیوں کے بارے اس طرح کے اِقدام سے کوئی خوف وحجاب لاحق ہوا، یہ تو ان کی اخلاقی پامالی تھی، لیکن اس اقدام سے یہ بھی پتہ چلا کہ نہ صرف معاشرتی سطح پر اس عمل کی سنگینی کا ادراک محو ہو چکا تھا، بلکہ اس طبقہ کی حیثیت و

پوزیشن اتنی مضبوط تھی کہ وہ اس قسم کے اقدامات کے ممکنہ معاشرتی عواقب سے قطعاً بےخوف و مطمئن تھے۔

قرآن مجید نے ان کے آنے کو ''ھرع'' سے تعبیر کیا ہے، جو کسی زخم سے نکلنے والے اس تیز دھار خون اور پیپ کی کیفیت کو کہا جاتا ہے کہ پچھلے کے مسلسل دباؤ سے اگلا رکنے کا نام ہی نہ لے۔ کسی جرم کی طرف علانیہ اس طور پر آنا کہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، دھکم پیل کرتے اور بےخبروں کو خبردار کرنے کے لیے ڈھنڈورا پیٹنے کا عمل بھی ساتھ جاری ہو، دھاریں مارتے ہوئے ہوئے ناپاک خون کی سی وہ کیفیت ہے جو گرد و پیش کو پوری طرح آلودہ کر کے رکھ دیتا ہے اور اپنے تسلسل کے باعث بدترین نفسیاتی پریشانی پیدا کر دیتا ہے۔ اس قوم کی مجرمانہ نفسیات کو سمجھنے کے لیے یہی ایک لفظ کافی ہے، قرآن مجید کے اسی ایک لفظ نے ان کی مجرمانہ ذہنیت کی سطح پوری طرح آشکارا کی ہے۔ نفسیاتی رو سے روحانی امراض کا یہ وہ خطرناک طبعی اثر ہوتا ہے جہاں خدائی قوانین سے انحراف معاشروں میں اجتماعی فساد فی الارض کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور فطرت کے خلاف اس درجہ بغاوت کے بعد معاشروں کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا، اس کے بعد خداوند قدوس کے نظامِ تکوین کی حرکیات کے تحت ان کا تذکار صرف ''عِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ'' کی شکل میں باقی رہتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے اعجازی اسلوبِ بیان کے تحت ان کی اس بھاگ دوڑ کے لیے جو لفظ اختیار کیا، اس کے مفہوم سے اشارہ ملتا ہے کہ سدومی معاشرہ کی مثال ایسے ناسور کی طرح ہے جس سے بہنے والا خون اور پیپ رکنے کا نام نہ لے، یعنی سدومیت کا ناسور معاشرہ کو ایسے ہی ناپاک کر کے رکھ دیتا ہے، جیسے مسلسل بہنے والے خون کے ساتھ پاکی کا تصور ممکن نہیں رہتا۔

قرآن مجید نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اہلِ سدوم کی یہ مجرمانہ سطح کسی اچانک اور وقتی جذبے اور انقلاب کا اثر نہیں تھا، بلکہ یہ معاشرہ ''سَيِّئَات'' کے ایک پورے پراسس سے گزر کر اس سطح تک پہنچا تھا۔ معاشروں کی تباہی کے لیے انسانیت میں خدا کی اعلانیہ بغاوت یکدم برپا نہیں ہوتی، انسان ضمیر کو بارہا شکست دیتے دیتے باغیانہ مقام تک پہنچتا ہے، لہٰذا معاشروں کو عمومی تباہی سے بچانا اسی وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب ''سَيِّئَات'' کے مرحلے پر اس سلسلہ کو روک لگا دی جائے، اگر یہ بند نہ باندھا جائے تو زمین کی تطہیر کے لیے تکوینی طور پر ریخت کا عمل برپا ہو کر ہی رہتا ہے، چاہے وہ تطہیرِ ارض براہِ راست آسمانی عذاب کی شکل میں ہو یا انسانوں کو انسانوں پر مسلط کرنے کی شکل میں۔

قرآن مجید اس بات کی بھی صراحت کرتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام قوم کی اس مجرمانہ سطح پر پہنچنے کے بعد بھی فرائضِ نبوت کی ادائیگی کے لیے سرگرمِ عمل رہے اور وعظ و انذار کے ذریعے قوم کی نفسیات کو دو انداز سے جھنجھوڑا۔ ایک تو انہیں خدا سے ڈرایا کہ انسان میں اگر جرم کی نفسیات غالب بھی ہوں، تب بھی اس کے

اعصاب پر بالاتر ہستی کا ایک خوف سوار ہوتا ہے اور اکثر اوقات یہی احساسِ خوف اسے جرم سے روک دیتا ہے یا جرم کا بوجھ اس کے سر پر سوار رکھتا ہے، جس سے اس کی اصلاح کی توقع موجود ہوتی ہے، لیکن مجرمانہ نفسیات کی منتہائی سطح پر خوف کا یہ احساس اس قدر مضمحل ہوجاتا ہے کہ تکوینی تھپیڑ کے بغیر اسے بیدار کرنا ممکن نہیں رہتا۔

خدا کی نصرت سے کسی نبی کی قوتِ توجہ اپنے عہد کے تمام تر لوگوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے، اس کی اعصابی طاقت مجرمانہ نفسیات کے سامنے کبھی اضمحلال کا شکار نہیں ہوتی، اس منتہائی مجرمانہ ذہن کے سامنے لوط علیہ السلام نے خدا خوفی کی دعوت کے ساتھ انہیں تکمیلِ شہوت کے جائز ذرائع کی نشان دہی کی کہ تمہاری بیویاں جو میری روحانی اولاد ہیں، تمہاری اس قسم کی توجہ و ترکیز کی زیادہ لائق ہیں۔ لوط علیہ السلام کا ان کی بیویوں کو اپنی بیٹیاں قرار دینا ایک تو نبوی شفقت و رأفت کا اظہار تھا، دوسرا یہ کہ حضرت لوط علیہ السلام اہلِ سدوم میں سے نہیں تھے، نسلی و قومی اجنبیت ایسے وحشی و بہیمی معاشروں میں بعض اوقات ایک کمزوری بن جاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوتی حکمت عملی کا یہ پہلو بڑا نمایاں ہے کہ وہ دعوت و انذار میں قوموں کے ساتھ اپنائیت کا لہجہ ترک نہیں کرتے۔ تیسرا یہ کہ نفسیاتی طور پر یہ اہلِ سدوم کے لیے ایک بہت بڑی عار بھی تھی کہ لوط علیہ السلام تو ان کے حرم کو بیٹی کا تقدس اور اپنائیت بخش رہے ہیں، لیکن ان کی حس ایسی بگڑ چکی ہے کہ وہ لوط علیہ السلام کے اجنبی مہمانوں کے درپے ہیں، لیکن جب غیرت مکمل مردہ ہو تو ایسی لطیف و باریک تعبیرات سے سبق لینا ممکن نہیں ہوتا۔

❸- حضرت لوط علیہ السلام کی تلقین سے معلوم ہوا کہ غیر جنس یعنی اپنی بیوی کی طرف میلان ہی فطری ہے۔ ہم جنسی میلانات قطعاً غیر فطری ہیں۔ فرائیڈ یا دیگر انگریز دانشوروں نے ہم جنس پرستی کو جو جینیاتی جرثوموں کی فطری تحریک کا عمل کہہ کر جواز بخشنے کی کوشش کی ہے، یہ قطعاً بلا دلیل ہے۔ یہ ممکن ہے کہ انسان بہیمی جذبات کے تحت فطری عفت کا آخری درجہ بھی زائل کر دے، جس کے بعد اس کی نظر میں محرمات و ہم جنس سے ملاپ کی بھی کوئی قباحت باقی نہیں رہتی، لیکن ماہرینِ نفسیات جانتے ہیں کہ اس درجہ تک رسائی روحانی کے ساتھ ساتھ ایک جسمانی مرض ہے، اور فطری جذبات سے انحراف اور بگاڑ ہے، ایسا انسان طب کی نظر میں غیر متوازن یعنی ابنارمل ہوتا ہے۔ فطرت سے اس انحراف کے نتیجے میں تحریکِ شہوت کے جرثوموں کی حرکیات بے قاعدہ ہوجاتی ہیں، لیکن انہیں توازن پر لانا ایسا ہی ممکن ہوتا ہے جس طرح دیگر جسمانی امراض میں مرض کے علاج کے ذریعے تعدیلِ مزاج ممکن ہوتا ہے، لیکن ان جرثوموں کا فطرتاً غیر متوازن ہونا اور اس بنیاد پر ہم جنس پرست میلانات کو فطری و جینیاتی کہنا علمِ نفسیات وطب کی رو سے خلافِ حقیقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات فطری ہوتی ہیں اور ان کی نکیر ہمیشہ غیر فطری امور پر رہتی ہے۔ لوط علیہ السلام کی سدومی مزاج پر نکیر اور انہیں اپنی

بیویوں سے قضائے شہوت کی تلقین اس کی واضح اور کافی دلیل ہے کہ انسان کے فطری مزاج اور جینیاتی نظام میں ہم جنس پرست میلانات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی مجرمانہ ذہنیت پر دوسری چوٹ یہ لگائی کہ آپ کا اس طرح کا اقدام معاشرتی رو سے بہت بڑی بے شرمی اور باعثِ رسوائی عمل ہے، جن افراد کے بارے میں آپ ناپاک عزائم لے کر وارد ہوئے ہیں وہ مہمان ہیں اور مہمان کے بارے میں اس طرح کے عزائم کا اظہار میزبان کی رسوائی ہے۔ کوئی معاشرہ کسی جرم کی جس درجہ لت کا شکار ہو، تاہم اگر اس میں حمیت کی رمق قدرے بھی باقی ہو تو وہ مہمانوں سے اجتماعی اور اعلانیہ بے حیائی کا ارتکاب کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، بعض اوقات خدا خوفی سے عاری اقوام معاشرتی رسم ورسوم کا تو کچھ لحاظ رکھ ہی لیتی ہیں، لیکن سدومی معاشرہ خدافراموشی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار بھی کھو چکا تھا، اس لیے حضرت لوط علیہ السلام کی اس دوسری تنبیہ سے بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کہہ دیا کہ آپ ہمارے ارادوں کو جانتے ہیں، ہم آپ کی پیش کردہ تجویز و ہدایت کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے، ہماری ترجیح تو آپ کے پاس آئے ہوئے مہمان ہیں۔ قوموں کی تباہی کی حد یہی سرخ لکیر ہوتی ہے جسے وہ پار کرکے دائمی غضب کی مرتکب ہوجاتی ہیں کہ ان کے پاس فطری حل موجود ہونے کے باوجود وہ خدا کی بغاوت پر مبنی طرزِ زندگی اور غیر فطری حل سے باز نہیں آتے اور جب ان کے سامنے فطری حل رکھا جائے تو وہ اسے یکسر مسترد کردیتے ہیں۔

❹-سدومی معاشرہ کی تباہی کے ذمہ دار جہاں وہ بدکردار تھے جو لوط علیہ السلام کے دروازے پر دھاوا بولے بیٹھے تھے، وہاں اس قوم کے دانشور بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے، کیونکہ قوم کے دانشوروں نے بھی اس عمل قبیح کو ان عادی مجرموں کا بنیادی ''حق'' (رائٹ) تسلیم کرکے معاشرتی سطح پر ان کی مغضوبانہ سرگرمیوں کو جواز بخشا اور جب لوط علیہ السلام نے قوم کے سامنے معقول اور منطقی بات رکھی اور اسے مسترد کیا گیا تو آخر میں یہی دہائی دی کہ کیا تم میں کوئی سمجھ دار انسان نہیں رہا؟ ظاہر ہے کہ جب دانشور اور سمجھ دار طبقہ جرم اور مجرم کا پشت پناہ بن جائے تو کون اسے رجل رشید کہے گا؟ خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی جو پیغمبر کے حرم کا حصہ ہونے کے باعث عفیفہ و طاہرہ تھی، قومی رجحانات کے تحت بدکرداروں کی اس گھناؤنی حرکتوں کو ان کا ''حق'' تسلیم کرتی رہی۔ ظاہر ہے جو خدا کی محرمات پر مجرمانہ خاموشی سے بڑھ کر اسے جواز بخشنے تک کا کفر کر بیٹھے وہ خدا کے عذاب سے کیونکر بچ سکتا ہے، اس لیے قومِ لوط جب اس کھلی بے حیائی پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئی اور ان پر پتھروں کی بارش کے ساتھ ان کی بستیوں کو اُلٹ کر پھینکا گیا تو معاشرے کا یہ آزاد خیال (براڈ مائنڈڈ) طبقہ بھی اس کی زَد میں آیا، یہاں تک کہ لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اپنے اس نظریے کے باعث عذاب الٰہی کا شکار ہوئی۔

❺-سدومیت انسانی رذالت کا انتہائی مقام ہے، اس لیے اس جرم کے عادی افراد میں رذالت پنپتی

ہے، جس کے باعث وہ بدترین احساسِ کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں اوراس شناخت کے ساتھ ایک اندرونی کرب وعذاب سے دوچار رہتے ہیں۔ اگر انہیں معاشرتی پذیرائی ملے تو گندگی کا احساس ان کے لاشعور میں موجود ہی رہتا ہے، جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام جب سدومیوں کو اس عملِ قبیح سے روکتے تھے تو وہ برملا کہتے تھے کہ انہیں اس بستی سے نکال دو، یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ گو کہ یہ کلام وہ لوط علیہ السلام اور مؤمنین پر بطور عیب جوئی کستے تھے کہ انہیں اپنی گندگی پر فخر تھا اور ان کی پاکبازی انہیں قبول نہیں تھی، لیکن اس کے لیے جو تعبیر اُن کی زبانوں سے صادر ہوئی، وہ ان کے لاشعور میں پڑی حقیقت کو آشکارا کرتی ہے کہ بہر حال طہارت و پاکیزگی کا نمائندہ تو لوط علیہ السلام اور مؤمنین ہی کا عمل ہے۔

❻-سدومی مزاج میں نامردی اور کمینگی پائی جاتی ہے، جس سے مردانہ خصائص ومزایا باقی نہیں رہ پاتے، نتیجۃً اس عمل کا عادی معاشرہ بے حوصلگی، مکاری، نامردی اور بزدلی کا شکار رہتا ہے۔ جب وہ طاقت سے عاری ہو تو اس کی رذالت انسانیت کے لیے ناسور ہوتی ہے اور جب ان کے پاس طاقت ہو تو ان میں تشدد کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ مغرب نے ہم جنس پرستی کو رواج دینے کی اعلانیہ بغاوت تو کرلی ہے، لیکن اس کے بدترین عواقب انہیں اسی صورت میں مل رہے ہیں۔

❼- سدومیت زدہ افراد اضطراب اور بے چینی کے حل کے لیے منشیات اور شراب نوشی کی طرف بڑھتے ہیں، جس سے معاشرہ کی عملی سرگرمیوں بالخصوص تعلیم وتعلم، انتظام وانصرام، نسق حکومت وغیرہ جملہ شعبہ ہائے زندگی میں ایک تعطل پیدا ہوجاتا ہے، اس تعطل کو قانون کے جبر اور سرمایہ کے زور سے عارضی طور پر گو روک لیا جائے، تاہم ایسے افراد کو جہاں قانونی چور دروازہ ملتا ہے تو ان کے تعطل کا اثر ان کے کاموں اور معاشرے پر ضرور پڑتا ہے، دنیا میں بڑھتے ہوئے نشے اور ان تباہ کاریوں کی پشت پر ایک حد تک سدومی جذبات کا بھی عمل دخل ہے۔ سدومیت زدہ افراد کی قوتِ ارادی بھی بری طرح مفلوج ہوجاتی ہے اور وہ عملاً کسی بلند ہدف تک رسائی نہیں پاسکتے۔

❽- سدومیت کا ایک بدترین اثر جسمانی امراض ہیں، قرآنی تصریح کے مطابق یہ گندگی ہے اور ہر گندگی کا اثر جہاں روح پر پڑتا ہے، وہاں اس کے جسمانی نقصانات بھی واضح ہیں، مثلاً ایڈز وغیرہ کے امراض اسی طرح کی گندگیوں کی پیداوار ہیں۔ ایسے افراد نفسیاتی اور دماغی بیماریوں کا بھی شکار ہوجاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر نے ایک نفسیاتی مریضہ کا جو میڈیکل کی طالبہ تھیں اور بیماری کے باعث پڑھائی چھوٹنے کے قریب تھی، مجھ سے رابطہ کروایا کہ اس کے کچھ مذہبی اشکالات ہیں، انہیں سن کر رہنمائی کی جائے، جب اس لڑکی سے اس کے حالات کی تفصیلی تاریخ لی گئی تو اس کے پس منظر میں یہ بات سامنے آئی کہ اس کی ایک دوسری رشتہ

دار لڑکی کے ساتھ ہم جنس پرستی کی لت نے اسے اس مرحلے تک پہنچایا تھا۔ نفسیاتی ڈاکٹروں کے پاس ایسے درجنوں کیس ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک میں جہاں یہ حیوانیت عام ہے، نفسیاتی امراض کی شرح ساری دنیا سے بڑھ کر ہے۔

❾ - ہم جنس پرستی کو فروغ دینے میں اس وقت جو ممالک سرگرم ہیں، ان میں امریکہ پیش پیش ہے۔ ہم جنس پرست تحریک ۱۹۲۰ء میں منظم ہوئی اور مختلف ممالک میں رفتہ رفتہ اپنے مقاصد مکمل کرتی رہی۔ ان کا جھنڈا بنا، انہیں قانونی حیثیت ملی، پھر ان ننگِ انسانیت افراد کو ''سٹارز'' کہا جانے لگا اور ان کی اس بہمیت سے بدتر عمل کو کمائی کا ذریعہ قرار دے کر ایک انڈسٹری تسلیم کرلیا گیا، پھر اسے انڈسٹری سے بڑھا کر خاندان کا متبادل تسلیم کیا جانے لگا اور برملا یہ نعرے اُٹھے کہ ہم جنس پرست عمر بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ چند سال قبل بھارتی سپریم کورٹ نے بھی ہم جنس پرستی کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کے ۱۱۳رممالک میں ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ حاصل ہے، جن میں مالی، اردن، قازقستان، ترکی، تاجکستان، کرغزستان، بوسنیا اور آذربائیجان جیسے ۹ مسلمان ممالک بھی شامل ہیں اور ۷۶ ممالک میں یہ غیر قانونی ہے۔ پاکستانی معاشرے کو تباہ کرنے کے لیے اس کی شکل ٹرانس جینڈر ایکٹ کی شکل میں سامنے لائی گئی، یعنی اندرونی احساس کے پیشِ نظر اگر ایک مرد خود کو بطور خاتون شناخت کروائے تو شناختی ادارے اس کے پابند ہیں کہ اسے عورت کی شناخت دیں، اس طرح یہی مرد عورت کی شناخت حاصل کر کے عورت کے حقوق کا بھی حامل ہوگا اور معاذ اللہ! کسی اور مرد سے عورت کی شناخت پر جنسی تعلق بھی قائم کر سکے گا۔ اس ایکٹ کو خواجہ سراؤں کے حقوق کے تناظر میں سامنے لایا گیا ہے، حالانکہ ٹرانس جینڈر کی تعریف اور اصطلاح ہی جدا ہے، خواجہ سرا کے لیے اصطلاح انٹرسیکس استعمال ہوتی ہے۔ اس ایکٹ کے منفی استعمال کا عالم دیکھیے کہ نادرا کے ریکارڈ کے مطابق صرف تین سال کے قلیل عرصے میں تقریباً ۲۸۷۳۳ درخواستیں موصول ہوئیں، جن میں ۱۶۵۳۰ مردوں نے اپنی جنس عورت میں تبدیل کروائی، ۱۲۱۵۴ عورتوں نے اپنی جنس مرد میں تبدیل کروائی اور جن کے لیے قانون بنایا گیا تھا، یعنی جن کی آڑ لی گئی تھی، جن کے تحفظ کا پرچار کیا گیا تھا، ان کی کل ۳۰ درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان میں ۲۱ خواجہ سراؤں نے مرد کے طور پر اور ۹ نے عورت کے طور پر حیثیت اختیار کی۔ اس سے اندازہ لگانا ممکن ہے کہ ہمارے معاشرے میں کس تیزی سے نقب لگانے کی کوشش جاری ہے۔

❿ - جیسا کہ عرض کیا گیا کہ کچھ لوگ اسے فطری اور جینیاتی مسئلہ کہہ کر جواز دینے کی کوشش کر رہے ہیں، پہلے پہل تو ایسے لوگ مغرب میں تھے، لیکن اب اسلامی دنیا میں بھی ان کے ''معصوم'' نمائندے پیدا ہو چکے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل جرمنی کی فریڈرِش ناؤمان اشٹفٹُنگ کے تعاون سے جرمن شہر مائنز میں اس موضوع پر ایک سیمنار کا اہتمام ہوا، جس میں نام نہاد اسلامی اسکالر ڈاکر محمد سمیر مرتضیٰ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مرتضیٰ نے کہا کہ ''قرآن میں ہم جنس پرستی سے متعلق کچھ بھی طے شدہ احکامات موجود نہیں ہیں۔ جب ہم ہم جنس پسندی کی بات کرتے ہیں، تو ہماری گفت گو زیادہ تر قومِ لوط کی کہانی سے جاملتی ہے، مگر قومِ لوط کی کہانی اصل میں ہم جنس پسندی کی کہانی نہیں تھی، بلکہ بائی سیکسچوئل اور جنسی تشدد کی کہانی تھی۔ شاید مسلم برادری کو ہم جنس پسندوں سے متعلق اپنی روش کو ازسرِ نو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ اگر کوئی ہم جنس پسند اللہ، ملائکہ، پیغمبروں، آسمانی کتب اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہے، تو کیا وہ مسلمان نہیں؟ ہمیں اس موضوع پر ضرور بات کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر سمیر نے جس چالاکی سے اسلام کے مسلمہ نقطۂ نظر میں تحریف کی کوشش کے لیے تشکیک کا ارتکاب کیا ہے، اسے ایک ادنیٰ مسلمان بھی بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔ قرآن مجید نے صرف قوم لوط علیہ السلام کے تناظر میں ہی نہیں، اس کے علاوہ بھی ہم جنس پرستی پر سزا کا ذکر کیا ہے، نیز احادیث اور فقہ اسلامی کا مسلمہ ذخیرہ اس باب میں مکمل قانون سازی کے ساتھ موجود رہا ہے۔ اور یہ کہنا کہ قومِ لوط کی کہانی جنسی تشدد کی کہانی تھی، واقعہ کا ادھورا تعارف ہے، وہ اس مرتبہ تک جس پراسس سے ہوکر گزرے تھے، اس پورے پراسس پر قرآن مجید نے تنقید کی ہے۔ نیز ان کا باہمی اختلاط تشدد کے بغیر باہمی رضامندی کی بنیاد پر تھا، قرآن کریم نے جہاں ان کے عملِ قبیح کا تعارف کروایا ہے، وہاں کہیں تشدد کی کوئی قید نہیں۔ آخر میں انہوں نے جس سوال کو اٹھایا ہے، یہ جذباتی تلویث (ایموشنلی بلیک میلنگ) اور منطقی مغالطہ ہے جو خدا کے محرمات کو حلال قرار دے، وہ خدا کا مسلم کیسے رہ سکتا ہے؟ ہاں! اگر کوئی اس عملِ قبیح کا نادانستہ مرتکب ہوگیا اور اس کی حرمت کا قائل رہا تو ظاہر ہے اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اسے کوئی بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں کہتا۔

باقی سدومیت کے اثرات سے نکلنا ناممکن نہیں کہ اس کا علاج چھوڑ کر اس میں تلویث گوارا کر لی جائے، بلکہ اس کے اثرات، محرکات اور دواعی سے نکلنا اسلامی نقطۂ نظر سے سو فیصد ممکن ہے، اس کے لیے صوفیاء کرام جو مسلم ماہرینِ نفسیات ہیں کے ہاں ایک مکمل تربیتی نظام موجود ہے۔ اس میں سب سے بنیادی نقطہ یہ ہے کہ سدومی مزاج ومیلان کا اِمالہ کرکے اسے خلافِ جنس یعنی عورت کی طرف پھیرنا ہوتا ہے، اس کے لیے اولین ضرورت صحبتِ صالح اور ماحول کی تبدیلی ہوتی ہے، ایسے افراد کو ایک لمبا عرصہ اگر گندے ماحول سے دور ایک پاکیزہ ماحول میں رکھا جائے تو ان کی ذہنی وقلبی تحریک اور جرثوموں کا توازن بحال ہونے لگتا ہے۔

ایسے افراد کو بھرپور جسمانی مشقت میں ڈالنا بھی مفید ہوتا ہے، یعنی دن بھر غیر معمولی مشقت کے کام

کروانا، سخت ورزش اور کم گوئی و کم خوری کا التزام، نیز تنہائی ختم کر کے صالح جلوت سدومی اثرات کو کم کرنے میں معاون ہوتی ہے۔

روزہ، صحت مند مطالعہ، رقتِ قلبی کے محرکات مثلاً موت اور آخرت کے تذکرے پر مبنی صالح لٹریچر، اہل اللہ کے مواعظ و بیانات اور ذکر و مراقبہ کی مجالس سدومی اثرات کے زوال کے لیے اکسیر ہیں۔ ایسے افراد کی مسلسل نگرانی کرنا ضروری ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے افراد سے اختلاط جن کی طرف میلان ہو سکے، ان سے مصافحہ کرنا، بغل گیر ہونا، مجالست، ساتھ کھڑا ہونا، ان کی طرف دیکھنا اور گفتگو کرنا سدومی اثرات کے خاتمے کے لیے موانع ہیں۔ ان موانع کو ختم کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے، ورنہ اس کے بغیر علاج ممکن نہیں ہوتا۔ ایک عرصہ اس التزام سے غیر جنس کی طرف میلان صحیح ہو جاتا ہے، جس کے بعد نکاح اس کا دائمی حل ہوتا ہے۔

سدومی اثرات کے اضمحلال کے بغیر ازدواجی زندگی بڑی پیچیدگیوں کا شکار ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسا مرحلہ آ جاتا ہے کہ میلانِ صحیح مکمل ختم ہو جاتا ہے اور عورت میں دلچسپی ہی باقی نہیں رہتی، جیسا کہ اہلِ سدوم نے اس کا اقرار کیا۔ اس کے نتیجے میں طلاقیں واقع ہوتی ہیں، گھر اُجڑتے ہیں اور خاندانی دشمنیوں کو وجود ملتا ہے۔ سدومیت زدہ افراد کو ان اثرات سے نکالنے کے لیے تربیتی دورانیے سے گزارنے کے بعد ہی ازدواجی عمل مفید ثابت ہوتا ہے، کیونکہ ان اثرات کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے جانبین میں جس توجہ و میلان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ قائم نہیں ہو پاتا، بلکہ بسا اوقات مرد میں تشدد کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے، جس کے سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کو جس ڈگر پر ڈالنے کی کوشش تسلسل کے ساتھ جاری ہے، اس کے خلاف تعلیمی اداروں، تربیتی مراکز، اصلاح وارشاد کے مختلف فورمز پر ایک ایسی تحریک کی ضرورت ہے، جہاں نئی نسل کو اس کے عواقب و نتائج سے باخبر کیا جا سکے۔ اہلِ اقتدار سے بھی درخواست ہے کہ اس ایکٹ کو واپس لینے اور اس باب میں مغربی آقاؤں کے دباؤ کو مسترد کرنے کا حوصلہ و جرأت پیدا کریں، ورنہ یہ آگ کل آپ کی نسلوں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ و ما علینا إلا البلاغ

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

فلسطین کے حقیقی باشندے اور حقدار

مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی
زامبیا، افریقہ

ارضِ موعود کی حقیقت

آج کے یہودی یا نام نہاد بنی اسرائیل کچھ بے بنیاد دعوے کی بنا پر فلسطین پر قبضہ کر چکے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین کے اصلی حقدار ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو فلسطین کی زمین کا وعدہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین کی سرزمین کو یہودی لوگ ''ارضِ موعود'' اور انگریزی زبان میں (The Promised Land) یعنی ''وہ زمین جس کا وعدہ کیا گیا'' کہتے ہیں، پھر وہ اپنی تاریخ کو ارضِ فلسطین سے اس طرح جوڑتے ہیں کہ ان کے جدّ امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ زمین عنایت کی گئی تھی۔ ایک زمانے میں یہودی اس سرزمین پر پائے جاتے تھے، اس سرزمین پر ایک مدت تک اُن کے آباء واجداد نے حکومت کی، اسی سرزمین پر ان کا ہیکل تعمیر ہوا تھا، اسی سرزمین پر حضرت داؤد علیہ السلام کی قبر ہے، اسی سرزمین پر مسجد اقصیٰ کے مغرب میں ان کا مقدس ''دیوارِ گریہ'' ہے، ان کا اس سرزمین سے روحانی تعلق ہے اور وہ سرزمین ان کے لیے مقدس ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آج کی دنیا میں جس طرح بہت سے دوسرے افکار ونظریات اور تہذیب وتمدن کے پیروکاروں کو اپنے افکار ونظریات اور عقائد کو بیان کرنے کی کھلی آزادی ہے، اسی طرح یہودیوں کو بھی اپنے افکار ونظریات اور عقائد بیان کرنے کا پورا حق اور آزادی ہے، مگر انھیں یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے افکار ونظریات دوسروں پر تھوپیں اور ان کا دوسروں کو پابند کریں۔ کسی بھی دین اور ملت کے ماننے والے اور اسی طرح یہودیوں کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے افکار اور عقائد کی بنیاد پر کسی قوم کو ان کے گھروں سے نکال دیں، ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ کرلیں، ان کی موروثی زمین کو ہڑپ کرلیں، ان کے مکان ودکان کو غصب کرلیں اور وہاں مکانات تعمیر کر کے اپنے دین وعقائد کے ماننے والوں کے حوالے کردیں۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ اخلاقی، سماجی اور قانونی طور پر جرم ہے۔

یہودیوں کا یہ ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو فلسطین کی زمین کا وعدہ کیا تھا، اس کی بنیاد یہ اقوال ہیں:

’’اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا تھا کہ اپنے وطن، اپنے لوگ اور والد کے خاندان کو چھوڑ دو اور اس جگہ جاؤ جو میں تمھیں دکھاؤں گا۔‘‘ (Genesis:۱۲:۱)

نیز یہ کہ:

’’اللہ تعالیٰ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر ظاہر ہوئے اور کہا: میں یہ ملک تیری اولاد کو دوں گا۔‘‘

(Genesis:۱۲:۷)

ان عبارتوں کے علاوہ بھی تورات میں پائے جانے والی چند دوسری عبارتوں کے سہارے یہودی فلسطین کو ’’ارضِ موعود‘‘ کہتے ہیں اور اس پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ ارضِ موعود کی حقیقت کے حوالے سے عیسائیوں کے پوپِ اعظم کا یہ نظریہ ہے کہ وہ وعدہ نہایت ہی مشکوک ہے۔ عیسائی اسکالرز کا ماننا ہے کہ بائبل میں جو وعدہ ہے، وہ بہت سی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، مگر یہودیوں نے اللہ کی نافرمانی کی، ان شرطوں کو پورا نہیں کیا اور اس سرزمین پر بداعمالیاں شروع کر دیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو سزا دی؛ لہٰذا اب اس وعدے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: القدس قضية كل مسلم للدكتور يوسف القرضاوي، ص: ٧٦ - ٨٠)

بنی اسرائیل کا فلسطین میں داخل ہونے سے انکار اور اس پر سزا

اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل اَڑیل، سرکش، مجرم اور بدبخت لوگ تھے۔ انھوں نے نہ صرف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد، بلکہ ان کی زندگی میں بھی ان کی نافرمانی کی اور احکامِ خداوندی کو ماننے سے انکار کیا۔ بنی اسرائیل کے لیے مصر میں حالات سازگار نہیں تھے۔ مصر کے حکمراں فرعون نے ان کو غلام بنا رکھا تھا۔ انھوں نے مصر میں چار سو تیس سال کی مدت بڑی کسمپرسی میں گزاری، پھر ایک وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ فلسطین میں جا کر آباد ہو جائیں، جو اُن کے لیے مقدر کر دی گئی ہے۔ (مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلسطین کو ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے لیے ’’ارضِ موعود‘‘ بنایا ہے اور وہ ہمیشہ فلسطین میں رہیں گے، جیسا کہ یہودیوں کا ماننا ہے۔) اس وقت فلسطین پر جس قوم کا قبضہ تھا، وہ عمالقہ سے جانی جاتی تھی اور وہ کافر تھی، چنانچہ بنی اسرائیل کو ان سے جہاد کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ جہاد میں بنی اسرائیل کو فتح ہوگی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے مطابق فلسطین کے لیے روانہ ہوئے۔ جب یہ لوگ فلسطین کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ عمالقہ بڑے ڈیل ڈول کے مالک اور طاقتور لوگ ہیں، چنانچہ بنی اسرائیل کو شکست کا خدشہ ہوا اور یہ فراموش کر گئے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فتح کا وعدہ کیا ہے اور

اللہ کا وعدہ پورا ہوکر رہے گا؛ چنانچہ بنی اسرائیل نے فلسطین میں داخل ہونے سے انکار کردیا اور اس پر اُن کو سزا دی گئی۔ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فلسطین کی طرف چلنے کو کہا؛ تو بنی اسرائیل نے ان کو جو جواب دیا:

’’قَالُوْا يٰمُوْسٰىٓ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ‘‘ (المائدہ:۲۴)

ترجمہ: ’’کہنے لگے کہ: اے موسیٰ ہم تو ہرگز کبھی بھی وہاں قدم نہ رکھیں گے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں تو آپ اور آپ کے اللہ میاں چلے جایئے اور دونوں لڑ بھڑ لیجیے، ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں۔‘‘

بنی اسرئیل کے اس بھونڈے جواب اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی۔ سزا یہ تھی کہ چالیس سال تک فلسطین میں ان کا داخلہ بند کردیا گیا۔ یہ لوگ صحرائے سینا کے ایک چھوٹے سے علاقے یعنی میدانِ تیہ میں بھٹکتے رہے، نہ آگے بڑھنے کا راستہ ملتا تھا، نہ پیچھے مصر واپس جاتے، وہ دن بھر چلتے، جب شام ہوتی تو پھر وہ اسی مقام پر پہنچ جاتے، جہاں سے صبح چلے تھے۔ قرآن کریم میں ہے:

’’قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ‘‘ (المائدہ:۲۶)

ترجمہ: ’’ارشاد ہوا تو یہ ملک ان کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا، یوں ہی زمین میں سر مارتے پھرتے رہیں گے، سو آپ اس بے حکم قوم پر غم نہ کیجیے۔‘‘

قرآن کریم نے فلسطین میں بنی اسرائیل کے داخل ہونے سے انکار، ان کی نافرمانی اور اس پر ان کو دی جانے والی سزا کو ان دو مذکورہ آیتوں میں بیان کیا ہے۔

سات سو سال تک بنی اسرائیل فلسطین میں ایک بالشت زمین کے بھی مالک نہیں تھے

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے وقت سے لے کر، سیدنا اسحاق علیہ السلام کا زمانہ، پھر یعقوب علیہ السلام کا زمانہ، پھر ان کا اپنے کنبہ کے ساتھ مصر ہجرت کرنا، پھر بنی اسرائیل کا چار سو تیس سال بعد فلسطین کے لیے لوٹنا اور سزا کے طور پر چالیس سالوں تک صحرائے سینا کے میدانِ تیہ میں بھٹکنا، یہ تقریباً ’’سات سو سال‘‘ کا لمبا عرصہ ہے۔ تورات کی وضاحت کے مطابق اس مدت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور بنی اسرائیل فلسطین کی زمین کے ایک بالشت کے بھی مالک نہیں تھے۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ اگر فلسطین بنی اسرائیل کے لیے ’’ارضِ موعود‘‘ ہے؛ تو پھر اتنے لمبے عرصے تک وہ فلسطین کی زمین کے ایک

بالشت کے بھی مالک کیوں نہیں بن سکے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسافر اور اجنبی بن کر آتے جاتے رہے اور بوقتِ ضرورت وہ فلسطین میں پناہ لیتے رہے۔ اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ مسافر جس مقام کا سفر کرتا ہے یا پناہ گزیں جس مقام پر پناہ لیتا ہے، وہ اس جگہ کا مالک نہیں بن جاتا۔ (القدس قضية كل مسلم، ص: ٥٠ - ٥١)

فلسطین پر یہودیوں کا حق نہیں

فلسطین کی سرزمین پر یہودیوں کا حق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سرزمین بنی اسرائیل کو اس وقت دی گئی تھی؛ جب کہ انھوں نے اللہ کے نبیوں اور رسولوں (علیہم السلام) کی قیادت میں اللہ کی وحدانیت کا جھنڈا بلند کیا اور توحید و رسالت پر استقامت کے ساتھ ڈٹے رہے۔ جب وہ توحید و رسالت کے پیغام سے منحرف ہو گئے، پیغامِ خداوندی کو بدل دیا، متعدد انبیاء علیہم السلام کا قتل کیا اور زمین میں فساد مچایا؛ تو ان کی ذلت و پستی شروع ہوئی۔ ان کو فلسطین سے ذلیل کر کے نکالا گیا۔ ان کو اس وقت کے کچھ حکمرانوں نے غلام بنایا اور بیت المقدس سے باہر نکال دیا۔ یہ ایک طرح کی سزا تھی جو بنی اسرائیل کو اس زمانے میں دی گئی، پھر فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں رہا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اصل پیروکار مسلمان

سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے بعد مسلمان اللہ کی وحدانیت کے سچے علم بردار اور انبیائی میراث کے حقیقی وارث ہیں۔ مسلمان وہ واحد امت ہے جو اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتی ہے اور انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت و تعلیمات لوگوں تک پہنچا رہی ہے۔ اسلام کی دعوت درحقیقت سیدنا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، موسیٰ، یوشع، داؤد، سلیمان، عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا استمرار و امتداد ہے، چنانچہ بنی اسرائیل کا ان انبیاء کرام (علیہم السلام) کی دعوت سے منحرف ہوجانے کے بعد اب ان کی میراث کے سب سے زیادہ مستحق مسلمان ہیں۔ یہ اہم نکتہ ہے کہ فلسطین کی سرزمین بنی اسرائیل کو کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نہیں دی گئی؛ چنانچہ فلسطین کی سرزمین پر حق جتانے کا مسئلہ رنگ و نسل سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ ان انبیاء کرام (علیہم السلام) کے منہج اور طریقہ کار کی پیروی سے متعلق ہے؛ چنانچہ مسلمانوں کا یہ ماننا ہے کہ ان انبیاء (علیہم السلام) کا سرمایہ مسلمانوں کا سرمایہ ہے، ان کا دعوتی کام مسلمانوں کا دعوتی کام ہے، ان کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس مقدس سرزمین پر حکمرانی کا جو موقع ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کے پیروکاروں کو دیا، اب مسلمان اس سرزمین پر حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں؛ کیوں کہ آج سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اصل پیروکار مسلمان ہیں۔ جو لوگ آج اپنے آپ کو یہودی کہتے ہیں، وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متبعین نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

’’مَا كَانَ إِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ‘‘ (آل عمران:۶۷-۶۸)

ترجمہ: ’’ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، ولیکن (البتہ) طریق مستقیم والے (یعنی) صاحب اسلام تھے۔ اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔ بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیات رکھنے والے (حضرت) ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور یہ ایمان والے اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے۔‘‘

اس آیتِ کریمہ کی تفسیر یہ ہے کہ: ’’یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے؛ اس لیے ہم یہودیت کو نہیں چھوڑ سکتے، عیسائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عیسائی قرار دیتے تھے، یہ دونوں باتیں صریحاً عقل کے اور مسلمہ تاریخی حقائق کے خلاف تھیں؛ کیوں کہ یہودیت اور عیسائیت کا تو وجود ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صدیوں بعد ہوا ہے، قرآن کریم نے یہاں اس نادانی پر متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اصولی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کے علمبردار اور شرک سے متنفر اور بیزار تھے۔ اگر تم واقعی اُسوۂ ابراہیمی کو اختیار کرنا چاہتے ہو؛ تو اس دینِ توحید کا دامن تھام لو، جس کی دعوت محمد رسول اللہ (ﷺ) دے رہے ہیں۔‘‘ (آسان تفسیر قرآن، حصہ اول، ص:۲۴۷)

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ سیدنا ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو کیا وصیت کی تھی اور کیا آج کے یہودی اس وصیت پر عمل کر رہے ہیں؟! قرآن مجید میں ہے:

’’وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ‘‘ (البقرہ:۱۳۲)

ترجمہ: ’’اور اسی کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم (علیہ السلام) اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب (علیہ السلام) بھی۔ میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام) کو تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے، سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔‘‘

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امامت وقیادت کا حقدار

قرآن کریم کی مزید ایک آیتِ کریمہ کی تلاوت کیجیے اور ذرا غور کیجیے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امامت وقیادت اور میراث کا مستحق ہونے کے لیے صرف ان کی نسل سے ہونا کافی ہے یا اُن کی پیروی کرنا

ضروری ہے؟ قرآن کریم میں ہے:

''وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ'' (البقرۃ:۱۲۴)

ترجمہ: ''اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں اور ان کو پورے طور پر بجالائے (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا: میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا۔ انھوں نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی کسی کسی کو (نبوت دیجیے)۔''

آیتِ مذکورہ بالا کی تفسیر میں درج ہے: ''دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل (علیہما السلام)۔ حضرت اسحاق علیہ السلام ہی کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نبوت کا سلسلہ انہی کی اولاد یعنی بنی اسرائیل میں چلا آ رہا تھا، جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا بھر کی پیشوائی کا حق صرف انہی کو حاصل ہے۔ کسی اور نسل میں کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا جو ان کے لیے واجب الاتباع ہو۔ قرآن کریم نے یہاں یہ غلط فہمی دور کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا ہے کہ دینی پیشوائی کا منصب کسی خاندان کی لازمی میراث نہیں ہے، اور یہ بات خود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صریح لفظوں میں کہہ دی گئی تھی۔ انھیں جب اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے آزمالیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے ہمیشہ تیار رہے، انھیں توحید کے عقیدے کی پاداش میں آگ میں ڈالا گیا، انھیں وطن چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، انھیں اپنی بیوی اور نوزائیدہ بچے کو مکہ کی خشک وادی میں تنہا چھوڑنے کا حکم ملا اور وہ بلا تأمل یہ ساری قربانیاں دیتے چلے گئے، تب اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا بھر کی پیشوائی کا منصب دینے کا اعلان فرمایا۔ اسی موقع پر جب انھوں نے اپنی اولاد کے بارے میں پوچھا تو صاف طور پر بتلا دیا گیا کہ ان میں جو لوگ ظالم ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کریں گے، وہ اس منصب کے حق دار نہیں ہوں گے۔ بنی اسرائیل کو صدیوں آزمانے کے بعد ثابت یہ ہوا ہے کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ قیامت تک پوری انسانیت کی دینی پیشوائی ان کو دی جائے، اس لیے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے صاحبزادے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بھیجے جارہے ہیں، جن کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی کہ وہ اہلِ مکہ میں سے بھیجے جائیں۔ اب چونکہ دینی پیشوائی منتقل کی جارہی ہے، اس لیے اب قبلہ بھی اس بیت اللہ کو بنایا جانے والا ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔'' (آسان ترجمۂ قرآن تشریحات کے ساتھ، ج:۱، ص:۹۴)

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ ''امامت و قیادت'' ان کی نسل اور کنبے میں سے ظالموں اور نافرمانوں کو نہیں دی جائے گی۔ آج جو خود کو بنی اسرائیل میں

سے کہتے ہیں، وہ خدائی فرمان کے نافرمان ہیں؛ جب کہ مسلمان اللہ کے فرمان پر عمل کرنے والی اُمت ہے؛ لہٰذا ان کی امامت وقیادت کا حقدار مسلمان ہوگا۔

عرب مسلمان بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں

اگر بالفرض مان لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا، وہ ان کی نسل سے متعلق لوگوں کے لیے ہے؛ تو پھر تو بنی اسرائیل کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ اسے اپنی ذات تک محدود رکھیں؛ کیوں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ایک لڑکے سیدنا اسماعیل علیہ السلام بھی تھے۔ اس مفروضے کی بنیاد پر سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی نسل بھی اس وعدے کی مستحق ہوئی جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو کیا گیا۔ پھر وہ سارے عرب بھی اس وعدے کے مستحق ہوئے جو اپنے جدِ اکبر عدنان کے واسطے سے اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ اسی عدنانی خاندان سے قریش ہے اور اسی قبیلۂ قریش سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور آج کے مسلمان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ اس سرزمین فلسطین کا وعدہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت کیا گیا تھا، جس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی اور ان کو یہ وعدہ اسماعیل علیہ السلام کی طہارت و پاکیزگی کے وقت کیا گیا تھا، اور ان کی پیدائش کے چودہ سال بعد، سیدنا اسحاق علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی؛ چنانچہ اس اعتبار سے بھی عرب اس وعدے کے زیادہ مستحق ہیں؛ کیوں کہ اسماعیل علیہ السلام کے واسطے سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام عربوں کے بھی جدامجد ہیں، یہی نہیں بلکہ قرآن کریم نے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سارے مسلمانوں کے باپ کے طور پر پیش کیا ہے:

''هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا'' (الحج:۷۸)

ترجمہ: ''اس نے تم کو (اور امتوں سے) ممتاز فرمایا ہے اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی (اس) ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو۔ اس اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے (نزول قرآن سے) پہلے ہی اور اس (قرآن) میں بھی۔''

عرب فلسطین کے اصل باشندے

جہاں تک فلسطین کی سرزمین پر حکمرانی کا تعلق ہے؛ تو بنی اسرائیل کی حکومت فلسطین میں ایک معمولی مدت کے لیے رہی ہے اور اس میں اہم مدت سیدنا سلیمان علیہ السلام کے اقتدار کی مدت ہے۔ اب رہی بات فلسطین پر مسلمانوں کے اقتدار کی؛ تو وہ زمانۂ خلافت عمری یعنی سن ۶۳۶ عیسوی سے تقریباً ۱۹۱۷ء عیسوی تک رہی۔ اس

طویل مدت میں، ۸۸ سال تک صلیبیوں کی حکومت رہی۔ اس ۸۸ سالہ مدت کو نکالنے کے بعد مسلمانوں نے فلسطین پر تقریباً بارہ صدیوں تک حکومت کی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہودیوں کی بڑی تعداد فلسطین سے سن ۱۳۵ عیسوی میں ہجرت کر گئی۔ جس وقت فلسطین مسلمانوں کے زیر تسلط آیا، اس وقت وہاں کوئی یہودی نہیں تھا۔ اس طرح تقریباً اٹھارہ صدیوں تک فلسطین سے یہودیوں کا کوئی تعلق نہیں رہا؛ جب کہ عرب فلسطینی یہودیوں سے پہلے ان کے ساتھ، پھر ان کے بعد بھی فلسطین کے باشندے رہے اور اب بھی ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں حکومت برطانیہ کے فلسطین پر مینڈیٹ کی مدت میں ایک سازش کے تحت یہودیوں کو دوسرے ممالک سے لاکر فلسطین میں بسایا جانے لگا۔ عرب لوگ تقریباً ساڑھے چار ہزار سال سے فلسطین میں رہتے آرہے ہیں اور انھوں نے اس سرزمین کو چھوڑ کر کسی مقام کی طرف ہجرت نہیں کی؛ چنانچہ عرب فلسطین کے اصل باشندے ہیں۔ جب سن ۱۹۴۸ء میں، غاصب قابض صہیونی ریاست کے قیام کا وقت آیا؛ تو صہیونیوں نے ظلم و جبر کی ساری حدیں پار کر دیں اور فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد کو ہجرت کے لیے مجبور کیا۔ صہیونیوں نے جن فلسطینیوں کو سن ۱۹۴۸ عیسوی میں مجبور کر کے فلسطین سے بھگایا، وہ آج بھی اپنے حق سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں؛ بلکہ وہ منتظر ہیں کہ انھیں موقع ملے اور وہ اپنے وطن فلسطین واپس آئیں۔

آج کے یہودیوں کا بنی اسرائیل اور فلسطین سے کوئی تعلق نہیں

تاریخی اعتبار سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا آج کے یہودی وہی بنی اسرائیل ہیں جن کے جد امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں؟ اس سوال کا مختصر جواب ہے: ''نہیں''، یہ اس لیے کہ بعض یہودی محققین و مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ آج کے اسّی فیصد سے زیادہ یہودیوں کا بنی اسرائیل یا فلسطین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں ایک آرتھر کوسٹلر جیسے یہودی مؤرخ بھی ہیں، انھوں نے ایک کتاب: (The Thirteenth Tribe : The Khazar Empire & Its Heritage) یعنی ''تیرہواں قبیلہ: خزر سلطنت اور اس کا ورثہ'' لکھی ہے۔ یہ کتاب سن ۱۹۷۶ عیسوی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کوسٹلر نے یہ ثابت کیا ہے کہ اشکنازی یہودی کا نسب خزر قوم سے ہے۔ اس کتاب میں یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ ''اشکنازی یہودی'' قدیم زمانے کے بنی اسرائیل سے نہیں ہیں؛ بلکہ ان کا تعلق خزر قوم سے ہے، جو ایک قدیم تاتاری ترکی قوم ہے۔ کوسٹلر کی یہ تحقیق ہے کہ خزر قوم نے آٹھویں صدی عیسوی میں یہودیت قبول کی۔ جب بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں خزر سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا تو یہ لوگ جنوبی روس اور مشرقی یورپ کی طرف ہجرت کر گئے، چنانچہ اگر انھیں اپنے وطن اصلی کی تلاش ہے؛ تو ان کو جنوبی روس جانا چاہیے۔ (القضية الفلسطينية خلفياتها التاريخية وتطوراتها المعاصرة للدكتور محسن محمد صالح، ص: ۲۷)

خلاصۂ بحث

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ فلسطین ارض موعود ہے، عیسائی اسکالرز کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بنی اسرائیل سرکش اور نافرمان لوگ تھے، انھوں نے اللہ اور اس کے نبیوں اور رسولوں کی نافرمانی کی اور اللہ نے ان کو سزا دی۔ اللہ تعالیٰ نے فلسطین کی سرزمین بنی اسرائیل کو اس وقت دی؛ جب انھوں نے انبیاء ورسل (علیہم السلام) کی قیادت میں توحید کا جھنڈا بلند کیا اور جب انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی تو وہ اس سرزمین کے مستحق نہیں رہے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعد مسلمان اللہ کی وحدانیت کے سچے علم بردار ہیں؛ چنانچہ وہ انبیائی میراث اور سرزمینِ فلسطین کے حقیقی وارث ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی امامت وقیادت اور میراث کا مستحق ہونے کے لیے ان کی نسل سے ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ ان کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ جس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام بنی اسرائیل کے جدِ امجد ہیں، اسی طرح ان عربوں کے بھی جد امجد ہیں جو اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ فلسطین پر بنی اسرائیل نے ایک مختصر مدت کے لیے حکومت کی؛ جب کہ مسلمانوں نے تقریباً بارہ صدیوں تک حکومت کی۔ آج جو لوگ خود کو یہودی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان میں اسّی فیصد سے زیادہ لوگ بنی اسرائیل سے نہیں ہیں؛ بلکہ ان کا تعلق ''خزر'' قوم سے ہے جو ایک قدیم تاتاری ترکی قوم تھی، جس نے آٹھویں صدی عیسوی میں یہودیت قبول کی۔ کنعانیوں کی اولاد یعنی عرب فلسطین کے حقیقی باشندے اور اصل حقدار ہیں؛ کیوں کہ وہ ساڑھے چار ہزار سال سے فلسطین میں رہتے آرہے ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

اچھے اور برے ناموں کے اثرات کی شرعی حقیقت

مفتی سید انور شاہ
استاذ جامعہ بیت السلام، کراچی

اسلام وہ دینِ فطرت ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس میں زندگی کے ہر شعبہ اور گوشہ کے متعلق احکامات اور ہدایات موجود ہیں، جن میں نقص و کمی، دشواری و تنگی اور ظلم و زیادتی نام کی کوئی چیز نہیں۔ اس کی پاکیزہ تعلیمات ایسی جامع، مکمل اور مفید ہیں کہ ہر ایک کے لیے، ہر جگہ، ہر زمانے اور ہر حالت میں قابلِ عمل اور دنیا و آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہیں۔ ایک سچے مسلمان کا یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مراحل اور امور میں اسلام کا صحیح معنوں میں متبع اور پیروکار بننے کی کوشش کرے۔

نومولود بچوں کے لیے عمدہ، دلکش اور بامعنی نام، جس سے اسلامی تشخص جھلکتا ہو تجویز کرنے، مہمل، بے معنی، غلط اور برے معانی کے حامل نام سے احتراز کرنے کے متعلق شریعت کے مفصل احکام و ہدایات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر میں یہ موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے، جسے نظرانداز کرنے کی ہرگز گنجائش نہیں۔ یوں تو ناموں کا موضوع دوسرے مذاہب اور دیگر اقوامِ عالم میں بھی اہمیت کا حامل رہا ہے، لیکن شریعت نے جس باریک بینی سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے متعلق مکمل رہنمائی فرمائی ہے، دنیا کے کسی بھی دوسرے مذہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

نوزائیدہ بچے کے لیے باپ کی طرف سے سب سے پہلا اور بہترین تحفہ

نام انسان کے تعارف کا ذریعہ ہے، اسی کے ذریعے وہ مخاطب کیا جاتا ہے، اسی سے انسان کی معاشرہ میں شناخت ہوتی ہے۔ بغیر نام کے اس کی شناخت اور پہچان دشوار ہے، اس لیے ہر زمانے میں اور ہر قوم میں نام کا رواج رہا ہے۔ نام بچے کے لیے زیب و زینت کا سامان ہے۔ اچھے، بامعنی اور دلکش نام سے دل میں اس کی عظمت قائم ہوتی ہے، جبکہ برے نام طبیعت پر گراں گزرتے ہیں، جس کا اثر بعض اوقات اس نام والے کو بھدّا بنا دیتا ہے۔ نام باپ اور سرپرست کی طرف سے وہ قیمتی تحفہ ہے جو انسان

کے ساتھ دنیا و آخرت میں ہمیشہ لگا رہتا ہے، کہیں جدا نہیں ہوتا، جس طرح آدمی نام سے دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے، ویسے ہی آخرت میں بھی اس کی شناخت اسی سے ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے مسلمانوں کو اپنے بچوں کے لیے اچھا، دلکش اور بامعنی نام رکھنے کا حکم دیا اور اس کو والدین پر اولاد کا حق قرار دیا، اور جن ناموں کے معانی اچھے نہیں ان کو رکھنے سے منع کیا۔

عمدہ نام اولاد کا والدین پر اہم حق ہے

بہرحال بچوں کے والدین پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ایک اہم ترین حق یہ ہے کہ بچہ کا اچھا نام رکھا جائے۔

خوبصورت، اور دلکش نام کا انتخاب اور برے ناموں سے اجتناب احادیث کی روشنی

آیئے! بچوں کے اچھے، بامعنی اور دلکش نام تجویز کرنے، مہمل، بے معنی اور برے ناموں سے احتراز کرنے کے سلسلے میں چند احادیثِ طیبہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ باپ پر بچے کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کا اچھا اور عمدہ نام رکھے اور اس کو حسنِ ادب سے آراستہ کرے:

۱- ''عن أبي سعيدؓ وابن عباسؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من ولد له ولد فليحسن اسمه وأدبه الخ.'' (شعب الإيمان: ١١/ ١٣٧، حقوق الأولاد، رقم الحديث: ٨٦٥٨)

ایک حدیث میں جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا نام باپ کی جانب سے پہلا اور بہترین تحفہ قرار دیتے ہوئے فرمایا:

۲- ''أوّل ماينحل الرجل ولده اسمهٗ، فليحسن اسمه.''

(جمع الجوامع: ٣/ ٢٨٥، حرف الهمزة مع النون، رقم الحديث: ٨٨٧٥، دار الكتب العلمية)

یعنی ''آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے، اس لیے بچے کا اچھا نام رکھنا چاہیے۔''

۳- ''عن أبي الدرداءؓ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماء آبائكم، فأحسنوا أسماءكم.''

(أبوداؤد: ٤/ ٢٨٧، باب في تغيير الأسماء)

یعنی ''قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے باپ کے ناموں سے پکارے جاؤ گے، لہٰذا اچھے نام رکھا کرو۔''

مذکورہ بالا احادیثِ طیبہ سے معلوم ہوا کہ:

①- باپ پر بچے کا ایک بنیادی اور اہم حق یہ بھی ہے کہ اس کے لیے اچھے سے اچھا نام تجویز کرے، لہٰذا باپ کو چاہیے کہ بچے کے اس حق میں کوتاہی اور غفلت سے کام نہ لے۔

②- نوزائیدہ بچے کے لیے سب سے پہلا اور بہترین تحفہ جو باپ اسے دے سکتا ہے وہ اچھا نام ہے؛ لہٰذا خوب سے خوب تر تحفہ دینے کی کوشش کرے۔

③- قیامت کے دن اپنے اور باپ کے نام سے پکارا جائے گا کہ فلاں آدمی جو فلاں کا بیٹا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ میدانِ حشر میں اگر کوئی برے نام سے پکارا گیا تو اس بھرے مجمع میں بڑی خفت اور سبکی ہوگی، اس لیے وہ دن آنے سے پہلے توجہ دی جائے اور خود یا کسی اللہ والے عالم سے اچھا نام منتخب کرا لیا جائے۔

یاد رکھیے: نام رکھنے کا مقصد محض تعارف اور پہچان نہیں، بلکہ درحقیقت مذہب کی شناخت اس سے وابستہ ہے۔ فکر وعقیدہ کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے؛ اس لیے اس سلسلے میں احادیثِ طیبہ میں خصوصی ہدایات دی گئیں ہیں۔ اچھے، دلکش اور بامعنی ناموں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور ایسے ناموں سے منع کیا گیا ہے جو برے معانی کے حامل ہوں۔

ناموں کے متعلق پیغمبرِ اسلام کی اصلاحات اور زمانۂ جاہلیت کا نظریہ

عرب معاشرہ شرک و بت پرستی اور نخوت وتکبر جیسے عیوب سے آلودہ ہو چکا تھا، ان عیوب کا اثر ان کے ناموں پر بھی پڑ گیا تھا، چنانچہ وہ اپنے لیے یا تو ایسے نام رکھنا پسند کرتے تھے، جن میں شرک و بت پرستی کا معنی موجود ہوتا، یا ایسے نام اختیار کرتے تھے جن میں جرأت، بہادری، تکبر وغرور اور بڑائی کا معنی موجود ہوتا۔ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ابوالرقیش اعرابی سے کسی نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تم لوگ اپنی اولاد کے لیے کلب (کتا)، ذئب (بھڑیا) جیسے برے نام تجویز کرتے ہو، جب کہ اپنے غلاموں کے لیے مرزوق (رزق دیا ہوا)، رباح (نفع پانے والا) جیسے عمدہ اور اچھے نام رکھتے ہو؟ ابوالرقیش اعرابی نے جواب میں کہا: بیٹوں کے نام دشمنوں کے لیے اور غلاموں کے نام اپنے لیے رکھتے ہیں، یعنی غلام تو اپنی خدمت اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے رکھے جاتے ہیں؛ اس لیے ان کے یہ نام رکھے گئے۔ اور اولاد چونکہ دشمنوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر جنگ کرتی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ نام تجویز کیے گئے، تاکہ ان کے نام سنتے ہی دشمن مرعوب ہو جائے۔ (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام: ۱/۲)

بہرحال عرب معاشرہ میں شرکیہ نام اور دیگر برے معانی پر مشتمل نام رائج ہو چکے تھے، چنانچہ عبدالعزیٰ (عزیٰ بت کا بندہ)، عبد الکعبۃ (کعبہ کا بندہ)، عبد الشمس (سورج کا بندہ)،

غراب (کوا)، عاص (گنہگار) جیسے برے نام ان میں عام ہو چکے تھے۔ اپنی بہادری اور بڑائی جتانے کے لیے بعض اوقات وہ جنگلی درندوں کے نام بھی رکھ دیتے تھے، مثلاً: لیث (شیر)، أسد (شیر)، ذئب (بھڑیا) وغیرہ۔

اسلام جو توحید اور امن وسلامتی کا دین ہے، تکبر ونخوت جیسے برے اوصاف سے بیزار ہے، اس لیے اس سلسلے میں حضور پاک ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی اسلام قبول کرتا اور اس کا نام قابلِ اصلاح ہوتا تو آپ ﷺ نہایت اہتمام سے اس کے نام کی اصلاح فرماتے تھے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''أن النبي صلی اللہ علیہ وسلم کان یغیر الاسم القبیح''، یعنی حضور ﷺ برے ناموں کو اچھے ناموں سے بدلتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک وفد حاضر ہوا، اس وفد میں ایک صاحب کا نام ''أصرم'' تھا۔ آپ نے اسی آدمی سے پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: ''أصرم''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم ''زُرعة'' ہو۔ (أبوداؤد :۳۰۸/ ۷، باب في تغییر الاسم القبیح)

أصرم کا معنی ہے: کاٹنے والا، قطع کلام وتعلق کرنے والا، جو کہ ایک منفی اور غلط معنی ہے، زُرعة کا معنی کھیتی یا بیج کے ہیں، یعنی دوسرے کو نفع پہنچانے والا جو ایک اچھا اور مثبت معنی ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک لڑکی کا نام جمیلة رکھ دیا، جس کا پہلا نام عاصیة (گناہگار) تھا۔ غزوۂ حنین کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک شخص سے پوچھا: آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: غراب۔ (غراب کوے کو کہتے ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا: آج سے تم غراب نہیں، بلکہ مسلم ہو: (الأدب المفرد باب/ ۸۲٤/ ۱)

ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ کتبِ احادیث میں اس جیسی بہت سی مثالیں ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی نظر میں ناموں کی غیر معمولی اہمیت تھی، جو نام قابلِ اصلاح ہوتا آپ ﷺ نہایت اہتمام سے اس کی اصلاح فرماتے تھے۔

شخصیت پر اچھے اور برے نام کے اثرات

یوں تو دیکھنے میں نام رکھنا ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ''نام میں کیا رکھا ہے؟'' حالانکہ یہ انتہائی غلط بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی شخصیت اور کردار پر اچھے نام کے اچھے اثرات پڑتے ہیں، جبکہ برے نام کے ممکنہ برے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، اس لیے شریعت نے معنی ومفہوم کے اعتبار سے اچھا نام رکھنے کا حکم دیا، تاکہ بچے کی زندگی کی شروعات کی پہلی اینٹ درست طور پر رکھی جائے۔ مشہور محدث اور فقیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: اپنی اولاد اور خادم وغیرہ کے لیے اچھے نام کا انتخاب کرنا سنت ہے، کیونکہ بسا اوقات برا نام تقدیر کے موافق ہو

جا تا ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا نام خسار (جس کے معنی گھاٹے اور نقصان کے ہے) رکھے تو ہوسکتا ہے کہ کسی موقع پر خود وہ شخص یا اس کا بیٹا تقدیرِ الٰہی کے تحت خسارہ میں مبتلا ہوجائے اور اس کے نتیجے میں لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس کا خسارہ اور نقصان میں مبتلا ہونا نام کی وجہ سے ہے اور بات یہاں تک پہنچ جائے کہ لوگ اس کو منحوس جاننے لگیں اور اس کی ہم نشینی سے احتراز کرنے لگ جائیں۔(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ٢٩٠٠/ ٧، باب الفال والطيرة. وكذا في مظاهر حق: ٣٠٠/ ٥)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو باقاعدہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ: لوگوں کے پاس ایسے آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجا کرو، جو خوبصورت اور اچھے نام والے ہوں۔ علماء لکھتے ہیں: ''اس کا سبب نفسیاتی تھا، اچھے نام اور اچھی صورت کا مخاطب پر اچھا اثر پڑتا ہے۔''(إحياء علوم الدين: ١٠٦/ ٤، بيان حقيقة النعمة)

لہٰذا جس طرح والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت وحفاظت کریں، ان کی نشوونما اور بہترین تعلیم وتربیت کی فکر کریں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ والدین بچوں کے لیے اچھے نام تجویز کریں۔ غرض انسان کی شخصیت پر نام کا اثر پڑتا ہے۔ اچھے ناموں کے اچھے اور برے ناموں کے برے اثرات ہوتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں یہ واقعہ منقول ہے: حضرت عبدالحمید ابن جبیرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ انہوں نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ میرے دادا جن کا نام حزن تھا، وہ ایک مرتبہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا: میرا نام حزن (جس کا مطلب ہے سخت اور دشوار گزار زمین) ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حزن کوئی اچھا نام نہیں ہے، لہٰذا میں تمہارا نام تبدیل کرکے حزن کے بجائے سہل رکھ لیتا ہوں۔ (سہل کا معنی ہے کہ نرم اور ہموار زمین جہاں انسان کو آرام ملے) اس پر میرے دادا نے کہا کہ میرے باپ نے میرے لیے جو نام رکھا ہے، میں اس کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''اس کے بعد سے ہمارے خاندان میں ہمیشہ سختی رہی۔''(بخاري: ٩١٤/ ٢/ في الأدب: باب اسم الحزن. وكذا في سنن أبي داؤد: ٦٧٧/ ٢/ باب في تغيير الاسم القبيح)

نام کے اثر انداز ہونے کے متعلق ایک عجیب واقعہ

اس سلسلے میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ عجیب وغریب واقعہ بھی ملاحظہ فرمالیں: حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک انجان شخص حاضر ہوا، سلام ودعا اور خیر وخبر کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے پوچھا: تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا: جمرة (انگارہ)، دریافت کیا: کس کے بیٹے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ: شہاب (آگ کا شعلہ)، پوچھا کہ کس قبیلہ سے تعلق ہے؟ اس شخص نے

کہا: حرقۃ (سوختہ شدہ، جلا شدہ بستی) سے، آپ نے سوال کیا، تمہاری رہائش کہاں ہے؟ جواب دیا: حرۃ النار (آگ کی سرزمین)، آپ نے پھر سوال کیا، کونسی جگہ میں؟ اس آدمی نے کہا: ذات لظی (آگ کے شعلوں سے بھڑکنے والا ٹیلہ) میں، یہ سن کر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جلدی اپنے گھر والوں کی خبر لو! وہ سب آگ میں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے ہیں۔ جب اس نے جا کر دیکھا تو ویسے ہی پایا، جیسا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا۔ (الموطا للإمام مالك: ۹۷۳/ ۲، باب مایکره من الأسماء. وكذا في مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: ۲۹۰۰/ ۷، باب الفال والطيرة)

ان دونوں واقعات میں آپ نے دیکھا کہ برے ناموں نے کیسا برا اثر کر کے دکھایا؟ پہلے واقعہ میں برے نام کی وجہ سے پورے خاندان میں سختی باقی رہی، جبکہ دوسرے واقعہ میں برے ناموں کی نحوست سے پورا گھرانا جل کر خاکستر ہوگیا۔ کتبِ احادیث میں اس جیسے اور بھی بہت سارے واقعات منقول ہیں، جن کو طوالت کے خوف سے ترک کیا جاتا ہے۔ علامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب تحفة المودود باحكام المولود اور حافظ علامہ ابن حجر العسقلانیؒ نے الإصابة في تمييز الصحابةؓ میں اس قسم کے کئی واقعات ذکر کیے ہیں۔ باذوق حضرات وہاں دیکھ سکتے ہیں۔

نام کا اثر اور جدید سائنس

شخصیت پر اچھے اور برے ناموں کے اثرات پڑنے کو جدید سائنس نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ ''سنتِ نبوی اور جدید سائنس'' میں ہے:

''جدید سائنس نے اچھے ناموں کو پسند کیا ہے، ان کی پسند دراصل ناموں کے الفاظ اور پھر ان کے اثرات کی وجہ سے ہے۔ پیرا سائکالوجی کے ماہر پروفیسر پیرل ماسٹر نے اپنی حالیہ تحقیق میں انکشاف کیا ہے کہ نام زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، حتیٰ کہ نام کے الفاظ کا ترجمہ بھی اپنے فوائد اور اثرات بدل دیتا ہے۔'' (سنتِ نبوی اور جدید سائنس: ۱/ ۳۰۳)

ناموں کی نفسیات پر تحقیق کرنے والے یونیورسٹی آف ایریزونا کے ماہرِ نفسیات ڈیوڈ زو کہتے ہیں کہ آپ کا نام، آپ کی شناخت سب سے اہم عنصر ہے اور اسی کی مدد سے لوگ آپ سے بات کرتے ہیں تو دوسروں کے ذہنوں میں آپ کی شبیہ بھی اسی کی وجہ سے بنتی ہے۔'' (بی بی سی نیوز: ۲۵ جولائی ۲۰۲۱ء)

کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ حال ہی میں سائنسی ماہرین نے ایک تحقیق پیش کی ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ انسانی شخصیت اور ناموں کے درمیان تعلق محض انہیں ایک انفرادی پہچان دینے کی حد تک نہیں ہے، بلکہ اس کے اثرات زندگی بھر انسانی شخصیت پر مختلف انداز میں جاری رہتے ہیں۔ اس تحقیق کے لیے ماہرین نے امریکہ اور کینیڈا میں سوشل سیکورٹی کا ریکارڈ جانچ اندازے قائم

کیے اور پھر اس مقصد کے لیے لوگوں کے نام، ان کی جائے پیدائش یا جائے رہائش، پیشہ اور دیگر عوامل کے بیچ ممکنہ تعلقات کو جاننے کی کوشش کی گئی۔ ماہرین نے اس مشاہدے میں یہ بھی دعویٰ کیا کہ بہت سے لوگ ایسے پیشوں کا انتخاب بھی کرتے ہوئے پائے گئے، جن کا تعلق ان کے نام سے کسی حد تک قائم کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا احادیثِ طیبہ، مستند واقعات اور سائنسی تحقیقات اور دیگر معتبر تفصیلات سے واضح ہوا کہ اچھے ناموں کے اچھے اور برے ناموں کے ممکنہ برے نتائج پڑ سکتے ہیں، اس لیے والدین کو چاہیے کہ اس معاملے کی اہمیت اور حساسیت کو جان کر اپنے بچوں کے لیے بامعنی، اچھے اور دلکش ناموں کا انتخاب کریں۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ ناموں میں یہ اثر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے، نام بذاتِ خود نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، اس لیے اس کو مؤثر بالذات سمجھنا ہرگز درست نہیں، نیز یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک پر ضرور بالضرور نام کے اثرات مرتب ہی ہوں گے، بلکہ ہوسکتا ہے کسی فرد پر نام کے اثرات مرتب نہ ہوں، لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ نام کے ممکنہ اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔

ناموں کے سلسلے میں ہماری کوتاہی اور غفلت

ناموں کے متعلق شریعت کی طرف سے اتنی زیادہ تاکید اور ترغیب وترہیب کے باوجود اس وقت مسلم معاشرہ غفلت، زبوں حالی اور جدت پسندی کا شکار ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ہمارے ننھے منے، جان سے پیارے بچے بدقسمتی سے صحیح اسلامی ناموں سے محروم ہوجاتے ہیں۔

جدت پسندی کا بھوت

آج کل لوگوں کا یہ مزاج بنتا جا رہا ہے کہ بچوں کے ناموں میں جدت ہو۔ ایسا نام رکھا جائے جو پڑوس، محلہ اور آس پاس کی آبادی اور اہلِ قرابت میں سے کسی کا نہ ہو، خواہ اس کا معنی اور مفہوم کچھ بھی نکلتا ہو، چنانچہ بعض اوقات جدت پسندی کے جنون میں لوگ ایسے نئے نئے نام تجویز کرتے ہیں جو یا بے معنی اور مہمل قسم کے ہوتے ہیں یا غلط معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ معارف القرآن میں رقم طراز ہیں:

> ''کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیا ہے، ان کی صورت وسیرت سے پہلے بھی ان کا مسلمان سمجھنا مشکل تھا، ان کے نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے انگریزی طرز کے نام رکھے جانے لگے۔'' (معارف القرآن: ۴/ ۱۳۲)

قرآن کریم سے نام تجویز کرنے کی شرعی حیثیت اور دلچسپ واقعہ

بعض سادہ لوح ناواقف مسلمانوں میں یہ رجحان بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ قرآن کریم سے نام

تجویز کرنے کو خیر وبرکت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کا معنی اور مطلب کیا ہے؟

آیا یہ نام مناسب بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ ایک مسجد کے نمازی نے اپنی بچی کا نام ''لِنتَ'' رکھا۔ مسجد کے امام صاحب نے تبدیل کرنے کا کہا تو جواب ملا کہ بچی کی دادی کو دورانِ تلاوت یہ لفظ پسند آیا تھا، اس لیے رکھا ہے، لہٰذا دادی کی خوشی کی خاطر اس نام کو تبدیل نہیں کرسکتے۔ حضرت مولانا مفتی مہربان علی بڑوتی صاحبؒ نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ شہر مظفر نگر کے دیہات میں ایک عورت نے جو ذرا قرآن کریم پڑھنا جانتی تھی، اس کے یہاں یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اس نے اپنے کو خواندہ سمجھتے ہوئے بچیوں کے نام تجویز کرنے کے لیے قرآن کریم سے ''سورۂ کوثر'' کا انتخاب کیا، چنانچہ بڑی بچی کا نام ''کوثر'' رکھا۔ دوسری کا نام ''وانحر'' تجویز کیا۔ اور تیسری کا نام ''أبتر'' مقرر کیا۔ کوثر اور وانحر کے معنی تو بحیثیتِ نام کسی حد تک درست بھی ہیں، لیکن آخری لفظ ''ابتر'' کا معنی تو بالکل غلط ہے جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ (مسلمانوں کے نام اور ان کے احکام: ۱/ ۱۳)

ایسے لوگوں کو بطور اصلاح کچھ کہا جائے تو سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم سے رکھے ہوئے ناموں کو تبدیل کرنا کون سے مسئلے کی بات ہے، حالانکہ قرآن کریم سے نام تجویز کرنے کی بات علی الاطلاق درست نہیں ہے، اس لیے کہ قرآن کریم میں حمار، کلب، خنزیر، بقرہ، فرعون، ہامان، قارون وغیرہ کے الفاظ بھی آئے ہیں، تو ان کے طریقِ استدلال کے مطابق ان الفاظ کے ذریعے بھی نام رکھنا صحیح ہونا چاہیے۔

نام اچھا ہونے کا معیار نیز ناول، فلموں اور دیگر غیرشرعی پروگراموں سے نام رکھنے کا حکم

لہٰذا نام کے اچھا یا برا ہونے کا معیار یہ نہیں کہ وہ نام پسند آجائے یا وہ قرآن کریم میں مذکور ہو، بلکہ اچھا ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں بھی وہ نام اچھا ہو۔ اسی طرح بعض لوگ اسلامی ہدایات کے برخلاف ناول، افسانوں، فلموں، ڈراموں اور دیگر غیرشرعی پروگراموں سے نام اخذ کرکے رکھتے ہیں، حالانکہ وہ نام یا تو فرضی ہوتے ہیں یا سراسر غیراسلامی، بلکہ بسا اوقات اس میں مذاہبِ باطلہ کی آمیزش ہوتی ہے جو انتہائی افسوس کن اور قابلِ اصلاح امر ہے۔

یاد رکھئے! نام کی حیثیت ایک قالب کی سی ہے جس میں انسان ڈھلتا ہے۔ نام کا انسان کی فطرت پر نفسانی اثر رہتا ہے۔ اچھے نام والا آدمی اپنے نام کا اچھا اثر محسوس کرتا ہے، چنانچہ جب اس سے پکارا جاتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک عجیب طرح کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اس کے برخلاف جس کا نام اچھا نہیں ہوتا وہ اپنے نفس کو جھنجھوڑتا رہتا ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

طبی اخلاقیات

مولانا ڈاکٹر فہد انوار
اسلام آباد

دائرہ کار، ضوابط، اخلاقی قدریں

تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں (پہلی قسط)

انسان اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں افضل ہے۔ شکل وصورت اور علم وشعور دونوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی دیگر مخلوقات پر برتری بخشی ہے۔ اسی کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا'' (الاسراء:۷۰)

''اور ہم نے آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو عزت دی، اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔''

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ'' (والتین:۴)

''کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔''

اس آیت کے تحت امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''انسان قد وقامت کے لحاظ سے متناسب اور شکل وصورت کے لحاظ سے حسین ترین ہوتا ہے۔ باقی سب حیوانات آگے کو جھکے ہوتے ہیں، جبکہ انسان سیدھی قد وقامت میں ہوتا ہے۔ اپنے کھانے کی چیز کو ہاتھ میں لیتا ہے، عقل اور اشیاء میں تمیز کرنے سے مزین ہوتا ہے۔'' (معالم التنزیل فی تفسیر القرآن:۸/ ۴۷۲، دار طیبہ)

اب وہ علم جس کا تعلق براہِ راست جسمِ انسانی کی حفاظت وبہتری سے ہے، وہ بھی شرافت کا حامل ہے، اسی لیے طب کا شعبہ ان فضائل کا حامل ہے جو دیگر شعبوں کو میسر نہیں۔ اس شعبے کا وقار اس بات کا تقاضا کرتا ہے

کہ اس سے وابستہ افراد اپنے اخلاق وعادات میں دوسروں سے ممتاز ہوں۔

نبی کریم ﷺ کی مبارک تعلیمات میں طبیب اور دیگر افراد جو صحت کے شعبے میں خدمات سرانجام دیتے ہیں، ان کے لیے رہنمائی ہے۔ آنے والی سطور میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں ان اقدار کے حوالے سے گفتگو کی جائے گی جن سے طبی میدان میں کام کرنے والے افراد بالخصوص معالجین (ڈاکٹرز) کو وابستہ ہونا ضروری ہے۔

❶ - نیت کی درستگی

اس حوالے سے ہم آنحضرت ﷺ کا وہ ارشاد نقل کرتے ہیں جس سے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کا آغاز کیا ہے:

''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَّنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهٗ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ .''(صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الوَحْيِ إِلٰى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ رقم: ١)

''تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر عمل کا نتیجہ ہر انسان کو اس کی نیت کے مطابق ہی ملے گا۔ پس جس کی ہجرت (ترکِ وطن) دولتِ دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی عورت سے شادی کی غرض سے ہو، پس اس کی ہجرت ان ہی چیزوں کے لیے ہوگی جن کے حاصل کرنے کی نیت سے اس نے ہجرت کی ہے۔''

اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں ایک طبیب کو چاہیے کہ وہ مریض کو دیکھتے ہوئے اپنی نیت دنیوی مفادات سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کرے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہوتے ہیں جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، لہٰذا یہ اچھے طریقے سے اللہ کے بندے کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کرے۔ یہ اس بات سے مانع نہیں کہ آدمی مریض سے فیس نہ لے، بلکہ جو مشورہ وہ دے رہا ہے اس کے بدلے میں مناسب اُجرت لینی بھی جائز ہے۔ ایسے ہی جو لوگ طب کی تعلیم وتحقیق سے وابستہ ہیں وہ بھی انسانیت کو فائدہ پہنچانے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کریں۔

❷ - صحیح مشورہ دینا

طبیب کی حیثیت ایک مشیر کی ہوتی ہے۔ لوگ اپنے جسمانی مسائل طبیب کے علم پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے سامنے رکھتے ہیں، تاکہ وہ ان کا حل بتاسکے، اس لیے طبیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ مریض کو بہتر

مشورہ دے۔ اپنے فائدے کی خاطر مریض کو ایسا مشورہ دینا گناہ ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہو، مثلاً جراح (سرجن) بلاضرورت مریض کو آپریشن کرا لینے کا مشورہ نہ دے۔

''عن أمِّ سلمة، قالت: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: ''المُستشارُ مُؤتَمَن.'' (سنن الترمذي، أبواب الأدب، باب انّ المستشارَ مؤتَمَن، رقم:٢٨٢٢)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس سے کسی معاملے میں مشورہ کیا جائے وہ اس میں امین ہے (اور اس کے سپرد امانت کی جاتی ہے)۔''

❸- اللہ تعالیٰ کے بندوں پر رحم کرنا

رحم ایک عمدہ صفت ہے، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں رحمان ورحیم بھی ہیں۔ دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت رحم کرنے والے ہیں۔ اپنے بندوں میں بھی اللہ تعالیٰ اس بندے کو پسند کرتے ہیں جس میں رحم دلی ہو۔ طبیب کے لیے رحم دل ہونا ضروری ہے۔ انسانوں کے دکھ درد کو محسوس کرکے ان کا علاج کرنا اس صفت کے بغیر ممکن نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ارشاد ہے:

''عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ ارْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ الخ.''

(سنن الترمذي، أبواب البر والصلة، باب في رحمة المسلمين، رقم:١٩٢٤)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر بڑی رحمت والا رحم کرے گا، زمین پر رہنے بسنے والی اللہ کی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحمت کرے گا۔''

❹- آسانیاں مہیّا کرنا

معالج کے منصب کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے لیے آسانیاں فراہم کرے۔ تکلیف میں مبتلا شخص اور اس کے احباب پر سے دشواریاں دور کرے اور انہیں مزید مشکلات میں نہ ڈالے۔ بے جا دوائیاں اور لیبارٹری ٹیسٹوں کی بھرمار کرکے مریضوں کو مالی مشکلات میں مبتلا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ایسے بندوں کو پسند فرماتے ہیں جو لوگوں کے لیے آسانیوں کی جائز صورتیں مہیا کرتے ہیں۔ معالج کو امید کی کرن بننا چاہیے نہ کہ تاریکیوں میں دھکیلنے والا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

''مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ فِي الدُّنْيَا يَسَّرَ اللهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.''

(سنن الترمذي، كتاب البر، باب ماجآء في الستر على المسلم، رقم: ١٩٣٠)

’’جو کسی آدمی کی دنیوی تکلیف کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں راحت سے نوازتے ہیں، جو تنگی میں مبتلا شخص کے لیے آسانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا آخرت میں آسانی فرماتے ہیں۔‘‘

❺-رازداری

طب کا شعبہ ایک احساسِ تحفظ کا تقاضا کرتا ہے، جہاں مریض ڈاکٹر کو علامات سے آگاہ کرنے میں آزاد ہو۔ بسا اوقات مریض کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے جس کا اظہار اس کے لیے شرمناک ہوتا ہے، مثلاً وظیفۂ زوجیت کی ادائیگی پر قدرت نہ ہونا، خواتین کے حیض سے متعلق مسائل وغیرہ۔ اس صورت حال میں طبیب کو مریض کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہیے اور بغیر اس کی اجازت کے معلومات آگے مشترک نہیں کرنی چاہئیں۔ مریض کے مرض اور جسمانی عیوب سے متعلق معلومات ڈاکٹر کے پاس ایک راز ہوتا ہے، جس کی حفاظت ضروری ہے۔ ایک جگہ آنحضرت ﷺ نے ایک مجلس میں کی جانے والی باتوں کو امانت قرار دیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

’’عن جابر بن عبدالله قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ’’المجالسُ بالامانةِ إلا ثلاثةَ مجالس: سفكُ دم حرام، أو فرجُ حرام، او اقتطاعُ مالٍ بغيرِ حق.‘‘ (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في نقل الحديث، رقم: ٤٨٦٩)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہیں (یعنی ایک مجلس کی بات دوسری جگہ جا کر بیان نہیں کرنی چاہیے) سوائے تین مجلسوں کے، ایک جس میں ناحق خون بہایا جائے، دوسری جس میں بدکاری کی جائے اور تیسری جس میں ناحق کسی کا مال لوٹا جائے۔‘‘

دوسری جگہ مسلمان کے عیوب چھپانے پر عظیم خوشخبری سنائی گئی ہے:

’’عَنْ اَبِيْ هُرَ يْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ فِي الدُّنْيَا يَسَّرَ اللهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ عَلٰى مُسْلِمٍ فِي الدُّنْيَا سَتَرَ اللهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ.‘‘

(سنن الترمذي، كتاب البر، باب ماجآء في الستر على المسلم، رقم: ١٩٣٠)

’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو کسی آدمی کی دنیوی تکلیف کو دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں راحت سے نوازتے ہیں، جو تنگی میں مبتلا شخص کے لیے آسانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا آخرت میں آسانی فرماتے ہیں۔ اور جو کسی مسلمان

کے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کی پردہ پوشی فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد فرماتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔‘‘

❻-مہارت

نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ آدمی کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے، مثلاً وضو کرے تو اچھی طرح کرے، ایسے ہی نماز پڑھے تو اچھی طرح پڑھے۔ اسی طرح جو جائز کام اپنے ذمے لے، اسے اچھے طریقے سے پورا کرے، چنانچہ ارشادِ گرامی ہے:

’’عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ’’ إِنَّ اللهَ جَلَّ وَعَزَّ يُحِبُّ إِذَا عَمِلَ اَحَدُكُمْ عَمَلًا اَنْ يُّتْقِنَهٗ.‘‘ (شعب الإيمان للبيهقيؒ، الأمانات وما يجب من أدائها إلى أهلها، رقم: ٤٩٣١)

’’بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کوئی عمل کرے تو اس میں پختگی پیدا کرے۔‘‘

اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں طبیب کے پاس اپنے شعبے اور جس مرض کا علاج کر رہا ہے اس کی مہارت ہونا ضروری ہے۔

ایک دوسری جگہ بطور خاص طبیب کے لیے مہارت اور علمِ طب میں اس کی شہرت ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ ارشادِ گرامی ہے:

’’مَن تطبَّب ولم يُعلم منه طِبٌّ قبل ذٰلك فهو ضامنٌ.‘‘

(سنن ابن ماجة، كتاب الطب، باب من تطبب و لم يعلم منه طب)

ترجمہ: ’’جو شخص اپنے آپ کو طبیب ظاہر کر کے علاج کرے، حالاں کہ اس سے پہلے اس کا طبیب ہونا معلوم نہ ہو (یعنی وہ فنِ طب کی مہارت میں مشہور نہ ہو اور علاج کرے، پھر اس کے علاج سے مریض کا کوئی عضو تلف ہو جائے، یا اس کا انتقال ہو جائے) تو وہ (مریض کا) ضامن ہوگا۔‘‘

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج کرنے والے شخص کے پاس متعلقہ طبی معلومات ہونا ضروری ہیں۔ طبیبِ جاہل کے علاج کے نتیجے میں مریض کو لاحق ہونے والے ضرر کی ذمہ داری اسی طبیب پر عائد ہوگی، لہٰذا علاج کرنے والے شخص کا صحیح معلومات رکھنا اور ماہر ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اسے علاج کرنے سے رک جانا ضروری ہے۔

❼ - سچ کی پابندی

طبیب کے لیے سچ کی پابندی کرنا بھی ضروری ہے۔ مرض کی درست تشخیص کرکے مریض اور اس کے متعلقین کو صحیح بات بتانا اور علاج کے دوران بھی جھوٹ سے بچنا ضروری ہے۔ مادی فوائد کے حصول کی خاطر جھوٹ بول کر مریض کو تشویش اور پریشانی میں ڈالنا یا بلاضرورت لیبارٹری ٹیسٹ تجویز کرنا کبیرہ گناہ ہے:

''عن عبداللہؓ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: ''إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ صِدِّيْقًا، وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ، وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ كَذَّابًا.'' (صحيح مسلم ،كتاب البر والصلة والآداب، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله، رقم:٢٦٠٢)

''بلاشبہ سچ آدمی کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور ایک شخص سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدیق کا لقب اور مرتبہ حاصل کرلیتا ہے اور بلاشبہ جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے، اور ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں بہت جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''

❽ - امانتداری

طبیب کے پاس مریض کا راز ایک امانت ہوتا ہے، اس کی حفاظت ضروری ہے۔ مرض کی تاریخ (ہسٹری) لیتے ہوئے یا معائنہ کرتے ہوئے جو بھی طبیب کے علم میں آئے، وہ ایک امانت ہے۔ تاہم مریض کا نام لیے بغیر آگے تعلیم یا تحقیقی مقاصد سے اسے بیان کرنا جائز ہے۔ ایسے ہی جو ذمہ داری طبی میدان میں کام کرنے والوں کو سونپی گئی اسے بھی ایک امانت سمجھ کر ادا کرنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مندرجہ ذیل ارشادِ گرامی سے امانت داری کی اہمیت معلوم ہوتی ہے:

''عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: ''آيةُ المنافق ثلاث، إذا حدَّث كذَب، وإذا وعَدَ أخلفَ، وإذا اؤتُمِن خان.''

(صحيح مسلم، باب بيان خصال المنافق)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے۔''

(جاری ہے)

کسٹم کا ضبط کردہ امپورٹڈ مال نیلام کرنا اور اُسے خریدنا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

ایک بندہ باہر ممالک سے کنٹینر وغیرہ کے ذریعہ مالِ تجارت (سامان) منگواتا ہے، پاکستان آکر اس پر حکومت کی طرف سے ٹیکس لگتا ہے اور بسا اوقات وہ ٹیکس بہت بھاری ہوتا ہے، جس کو تاجر ادا نہیں کر سکتے یا ادا نہیں کرتے۔ تو حکومت وہ مال اپنے پاس ٹیکس کی عدمِ ادائیگی کی وجہ سے روک لیتی ہے اور پھر حکومت کچھ عرصہ کے بعد وہ مالِ تجارت نیلام کر دیتی ہے (یعنی پانچ یا چھ برس کے بعد)۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ: اس نیلام مال سے کسی دوسرے آدمی کے لیے مال خریدنا کیسا ہے؟ جواز اور عدمِ جواز کی صورت میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

المستفتی: صدیق الرحمٰن

الجواب حامداً و مصلیاً

حکومت نے اشیاء کی درآمد اور برآمد پر جو ٹیکس مقرر کر رکھا ہے، اس کو ''کسٹم'' کہتے ہیں، اور حکومت کسٹم نہ دینے کی صورت میں یا کسی اور وجہ سے جو امپورٹڈ مال ضبط کر کے نیلامی کرتی ہے، اس کو عرف میں ''کسٹم کا مال'' کہا جاتا ہے، اس کی تقریباً پانچ صورتیں ہیں:

❶- جرمانہ کی صورت میں ضبط کیا ہوا مال

❷- ڈیوٹی کا مال

❸- ڈیمرج (Demurrage) زیادہ لاگو ہونے کی وجہ سے چھوڑا گیا مال

❹- رضامندی سے چھوڑا ہوا مال

❺-لاوارث مال

ان پانچوں صورتوں کے مال کی خرید وفروخت کا حکم درج ذیل ہے:

❶-جرمانہ کی صورت میں ضبط کیا ہوا مال

حکومت بعض اموال امپورٹر سے جرمانہ کے طور پر ضبط کرلیتی ہے، مثلاً:

①-قانون کے خلاف مال آئے تو حکومت ضبط کرلیتی ہے۔

②-بعض اوقات مخصوص مقدار تک سامان بیرون ممالک سے امپورٹ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس سے زیادہ امپورٹ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، اگر کوئی امپورٹر اس مخصوص مقدار سے زائد مال لایا تو حکومت ایسا مال وسامان ضبط کرلیتی ہے۔

③-بعض چیزیں امپورٹ کرنا قانونی اعتبار سے منع ہے، اگر کوئی امپورٹر ایسی ممنوع چیز لے کر آتا ہے تو حکومت ضبط کرلیتی ہے، ان صورتوں کے علاوہ مال ضبط کرنے کی اور بھی صورتیں ہوں گی۔

بہرحال امپورٹر کا مال ضبط کرنا اور اسے جرمانہ کے طور پر اپنی تحویل میں لینا جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ مالی جرمانہ لاگو کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، البتہ حکومت جائز قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکتی ہے، لہٰذا حکومت ایسا مال نیلام کرے تو معلوم ہونے کی صورت میں ایسا مال خریدنا اور بولی میں حصہ لینا جائز نہیں ہے۔

❷-ڈیوٹی کا مال

ڈیوٹی سے مراد وہ مال ہے جو امپورٹر کو باہر ممالک سے قانونی طور پر منگوانے کی اجازت ہوتی ہے اور حکومت اس پر ڈیوٹی (ٹیکس) عائد کرتی ہے، اس میں سیلز ٹیکس اور دوسرے ٹیکسز شامل ہوتے ہیں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ امپورٹر ٹیکس اور ڈیوٹی ادا نہیں کرتے، حکومت ان کو نوٹس دیتی ہے کہ اتنے دنوں تک اپنی ڈیوٹی ادا کرکے اپنا مال اُٹھالیں، ورنہ سارا مال ضبط کرلیا جائے گا، اس نوٹس کے بعد بعض لوگ ٹیکس اور ڈیوٹی ادا کرکے اپنا سامان اُٹھالیتے ہیں، بعض لوگ ڈیوٹی ادا نہیں کرتے اور مال وہیں چھوڑ دیتے ہیں اور حکومت اس کو ضبط کرلیتی ہے، پھر اس کو فروخت کرکے اپنا ٹیکس وصول کرتی ہے، جان بوجھ کر ایسے مال کو خریدنے سے بھی بچنا چاہیے، اس لیے کہ اس کو بیچنے پر اصل مالک راضی نہیں ہے اور اصل مالک کی اجازت کے بغیر مال بیچنا جائز نہیں ہوتا۔

❸- ڈیمرج (Demurrage) زیادہ لاگو ہونے کی وجہ سے چھوڑا گیا مال

امپورٹر جب باہر ممالک سے مال منگواتا ہے تو بعض اوقات ائیر پورٹ اور بندرگاہ وغیرہ سے بروقت مال کو کلیئر نہیں کیا جاتا اور اس کا ڈیمرج (Demurrage) بڑھ جاتا ہے، ڈیمرج کبھی مال کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ بن جاتا ہے، ایسی صورت میں نوٹس دینے کے باجود امپورٹر مال کلیئر کر کے مال وصول نہیں کرتا، اور وہ گودام میں پڑا رہتا ہے، بعد میں کسٹم حکام ڈیمرج حاصل کرنے کے لیے اسے نیلام کردیتے ہیں۔ کسٹم حکام کے لیے ڈیمرج حاصل کرنا جائز ہے، کیوں کہ یہ اصل میں اس گودام یا جگہ کا کرایہ ہے جہاں مال رکھا گیا ہے، لہٰذا کسٹم والے ایسا مال نیلام کر کے ڈیمرج کی حد تک اپنا حقِ اُجرت وصول کرسکتے ہیں، اور کسٹم والوں سے ایسا مال خریدنا بھی جائز ہے، اگر ڈیمرج کی رقم سے زیادہ پر فروخت ہو تو کسٹم والوں پر بقیہ رقم اصل مالک یا اس کے ورثاء تک پہنچانا لازم ہوگا۔

❹- رضامندی سے چھوڑا ہوا مال

بعض اوقات امپورٹر کسی خاص وجہ کی بنا پر اپنا درآمد کیا ہوا مال وصول نہیں کرتا، مثلاً: بعض اموال کو برآمد کرنے پر پابندی ہے اور بعض اموال کے برآمد کی اجازت ہے، مگر حکومت کی جانب سے ایک حد متعین ہے، لیکن کچھ امپورٹر اس طرح کا مال چھپا کر زیادہ لے آتے ہیں، اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر پکڑا گیا تو چھوڑ دیں گے یا کچھ رقم دے کر چھڑا لیں گے، لیکن ایسا آسان نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے سستا اور کم قیمت سامان منگوایا جاتا ہے، لیکن اس پر ڈیوٹی زیادہ لگتی ہے، ڈیوٹی دے کر چھڑانے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا، لہٰذا ایسے مال کو پورٹ میں چھوڑ دیا جاتا ہے، کسٹم والوں کی طرف سے نوٹس بھی ملتا ہے، لیکن امپورٹر ایسے مال کو وصول نہیں کرتا تو ایسے مال کا حکم ''لقطہ'' کا ہے، کسٹم والوں کے لیے ایسے مال کو نیلام کرنا اور لوگوں کے لیے ایسے مال کو خریدنا جائز ہے، تاہم کسٹم والوں پر جگہ کی اُجرت وغیرہ نکال کر باقی رقم مالک کو واپس کردینا ضروری ہے۔

❺- لاوارث مال

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ کسٹم میں کسی نے مال بھیجا، لیکن بعد میں اس نے کسی وجہ سے مال وصول کرنے کے لیے رابطہ نہیں کیا اور کسٹم حکام بھی بعض دفعہ کسی وجہ سے رابطہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں، ایسے مال کا حکم بھی ''لقطہ'' والا ہوگا، ایسی صورت میں کسٹم حکام جب تک ممکن ہو مالک کے آنے کا انتظار کریں اور اگر انہوں

نے اتنی مدت تک انتظار کیا کہ مالک آنا چاہتا تو آسکتا، لیکن خود بھی نہیں آیا، رابطہ بھی نہیں کیا، کسی وکیل اور نمائندہ کو بھی نہیں بھیجا تو اس صورت میں مجبوراً کسٹم حکام اس مال کو فروخت کرسکتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایسے مال کو خریدنا بھی جائز ہے، البتہ مال فروخت کرنے کے بعد جو رقم ملے گی وہ کسٹم حکام کے لیے حلال نہیں ہوگی، بلکہ مالک کے لیے محفوظ رکھنی ہوگی، اور فروخت کرنے کے بعد اگر مالک آجائے تو رقم اس کو دے دیں، ورنہ اس کی رقم لاوارث، ضرورت مند، غرباء اور فقراء پر صدقہ کردی جائے، یا ان کی ضروریات میں صرف کردی جائے۔

اور مذکورہ صورتوں میں اگر خریدار کو حکومت کی طرف سے نیلام کردہ سامان کے بارے میں اصل صورت حال کا یقینی علم نہ ہو تو چوں کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ ''لقطہ'' ہونے کی صورت میں متعلقہ ادارے نے اس کی تشہیر کرائی ہوگی اور مالک کو تلاش کیا ہوگا، اور مالک کے ملنے سے مایوسی کے بعد اس کو فروخت کیا جارہا ہے، یا یہ سامان کسی واجبی حق کی وصول یابی کے لیے نیلام کیا جارہا ہے، مثلاً حکومت یا اس کے متعلقہ ادارے کے پاس گروی رکھا ہوا سامان وغیرہ، یا ڈیمرج کی وصولی کے لیے فروخت کیا جارہا ہے یا رضامندی سے چھوڑا ہوا مال ہے، (اور خریدار کو یقینی طور پر اس کا علم بھی نہیں ہے) اور وہ یہ سامان خرید لے تو اس کی آمدنی کو ناجائز نہیں کہا جائے گا، البتہ ایسی صورت میں اس کے خریدنے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ٹیکس ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے چھوڑے گئے مال کا حکم ''لقطہ'' کا ہے، لوگوں کے لیے ایسا مال خریدنا جائز ہے، تاہم کسٹم والوں پر جگہ کی اُجرت وغیرہ نکال کر باقی رقم مالک کو واپس کرنا ضروری ہے۔

السنن الكبرى للبيهقي (٥ /٣٣٥):

''عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ -صلى الله عليه وسلم- اَنَّهُ قَالَ : ''مَنِ اشْتَرٰى سَرِقَةً وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهَا سَرِقَةٌ فَقَدْ اَشْرَكَ فِي عَارِهَا وَإِثْمِهَا .''

(كتاب البيوع،باب مبايعة من أكثر ماله من الربا أو ثمن المحرم، ط:مجلس دائرة المعارف، هند)

البحر الرائق شرح كنز الدقائق (٥ /١٧٠):

''قولهُ (و ينتفع بها لو فقيرًا وإلا تصدق على اجنبي ولأبو يه وزوجته وولده لو فقيرًا) أي ينتفع الملتقط باللقطة بأن يتملكها بشرط كونهِ فقيرًا نظرًا من الجانبين كما جاز الدفع إلى فقيرٍ آخر، وأما الغني فلا يجوز له الانتفاع بها، فإن كان غير الملتقط فظاهرٌ للحديث، فإن لم يجيء صاحبها فليتصدق بها، والصدقة إنما تكون على الفقير كالصدقة المفروضة وإن كان الملتقط فكذٰلك ..... وإنما فسرنا الانتفاع بالتملك لأنهُ ليس المراد الانتفاع بدونه كالإباحة

ولذا ملك بيعها وصرف الثمن إلى نفسه كما في الخانية أطلق في عدم الانتفاع للغني، فشمل القرض، ولذا قال في فتح القدير: وليس للملتقط إذا كان غنيًا أن يتملكها بطريق القرض إلا بإذن الإمام وإن كان فقيرًا فلهٗ أن يصرفها إلى نفسه صدقةً لا قرضًا.'' (كتاب اللقطة، ط:دار المعرفة، بيروت)

الدر المختار و حاشيته لابن عابدين (۳۹۰/ ۵):

''قلت وسيجيء في الحجر أنه يباع ماله لدينه عندهما و به يفتى وحينئذ فلا يتأبد حبسه فتنبه. قوله (وحينئذ فلا يتأبد حبسه) أي على قولهما وكذا على قوله إن كان ماله غير عقار ولا عرض بل كان من الأثمان ولو خلاف جنس الدين كما قدمناه.'' (كتاب القضاء، فصل في الحبس، ط:سعيد)

حاشية رد المحتار على الدر المختار (۳۸۷/ ۵):

''لا يبيع القاضي عرضه ولا عقاره للدين خلافا لهما و به أي بقولهما يبيعهما للدين يفتى اختيار وصححه في تصحيح القدوري و يبيع كل ما لا يحتاجه للحال اهـ.'' (كتاب القضاء،فصل في الحبس،مطلب في ملازمة المديون،ط:سعيد)

الدر المختار و حاشيته لابن عابدين(۹۸/ ۵):

''وفيه الحرام ينتقل، فلو دخل بأمان وأخذ مال حربي بلا رضاه وأخرجه إلينا ملكه وصح بيعه لكن لا يطيب له ولا للمشتري منه. قوله (الحرام ينتقل) أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك و يأتي تمامه قريبا قوله (ولاللمشتري منه) فيكون بشرائه منه مسيئا لأنه ملكه بكسب خبيث وفي شرائه تقرير للخبث و يؤمر بما كان يؤمر به البائع من رده على الحربي لأن وجوب الرد على البائع إنما كان لمراعاة ملك الحربي ولأجل غدر الأمان وهذا المعنى قائم في ملك المشتري.''

(كتاب البيوع،باب البيع الفاسد، مطلب الحرمة تتعدد، ط:سعيد)

فقط واللہ اعلم

کتبہ

عزیز محمود دین پوری

دارالافتاء

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

الجواب صحیح

محمد انعام الحق

الجواب صحیح

ابوبکر سعید الرحمٰن

الجواب صحیح

محمد شفیق عارف

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

نَقدُ و نَظَر

ادارہ

قدرتی غذاؤں سے مہمان نوازی

جمع و ترتیب: مولانا عطاء اللہ احسان صاحب، و مولانا یاسین نور الحسن صاحب۔ صفحات: ۱۶۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: بیت العلم، اردو بازار، کراچی۔ رابطہ نمبر: 021-32726509

زیرِ تبصرہ کتاب کا موضوع اپنے عنوان سے ظاہر ہے، مہمان نوازی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، دینی اور معاشرتی لحاظ سے ایک مستحسن، قابلِ تعریف عمل ہے، جس کے دینی اور دنیوی کئی فوائد ہیں۔ مہمان نوازی کے کئی آداب ہیں، نیز مہمان کو پیش کی جانے والی کھانے پینے وغیرہ کی اشیاء کیسی ہونی چاہئیں، افادیت اور سنت کی رعایت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کتاب میں ان موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب تین ابواب میں تقسیم ہے: ۱-مہمان نوازی کے فضائل اور اس کے آداب۔ ۲-صحت بخش قدرتی غذائیں، مشروبات اور ان کے فوائد۔ ۳-مضرِ صحت اور کیمیکل ملی ہوئی غذاؤں اور مشروبات کے نقصانات۔

کاغذ اعلیٰ ہے، سیٹنگ اور پرنٹنگ بھی اچھی ہے۔ بائنڈنگ کارڈ کور پر ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع سے متعلق مواد اور معلومات سے بھرپور ہے، ماشاء اللہ بہترین کتاب ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب ہر فرد اور ہر گھر کی ضرورت ہے۔

معروضاتِ جمعہ (جلد اول)

بیان: مولانا محمد خالد العباسی صاحب۔ صفحات: ۲۲۶۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارۃ العباسیۃ للنشر والتوزیع، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0333-2972550

زیرِ تبصرہ کتاب مولانا موصوف کے جمعہ کے خطبات کی پہلی جلد ہے، جس میں ۱۲ بیانات درج ہیں۔ پہلی جلد کے عنوان سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اس طرح کے بیانات کا ایک مجموعہ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ بیانات کے بنیادی اور ذیلی عناوین اچھے ہیں، مواد بھی ماشاء اللہ بہترین ہے۔

کتاب کا کاغذ عمدہ ہے، مگر سیٹنگ، علاماتِ ترقیم وغیرہ کا اہتمام نہیں ہے۔ فونٹ کشیدہ رکھا گیا ہے، جو بلاوجہ صفحات کی کثرت کا سبب ہے اور اہلِ ذوق کو بھلا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ہماری رائے ہے کہ تصنیف و تالیف کے کام کے لیے اہلِ رائے سے مشاورت کا اہتمام فرمالیں۔